ماہنامہ
صراطِ مستقیم
برمنگھم

April 2026





وَمَن يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

SIRAT-E-MUSTAQEEM BIRMINGHAM

صراطِ مستقیم برمنگھم

بیاد

مولانا فضل کریم عاصم رحمہ اللہ

مولانا محمود احمد میرپوری رحمہ اللہ

Vol: 46 No. 06 April 2026

Shawal/ Dhul Qadah1447 AH

جلد: 46 شمارہ: 06 اپریل 2026ء

شوال/ذوالقعدہ: 1447ھ

فہرست مضامین

Correspondence Address:
SIRATE-MUSTAQEEM
20 Green Lane, Small Heath,
Birmingham B9 5DB
Tel: 0121 773 0019
Fax: 0121 766 8779

ناشر: مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ
Markazi Jamiat Ahl-e-Hadith UK
www.mjah.org.uk/siratemustaqeem
E-mail: info@mjah.org.uk



مذہبی انتہاء پسندی اور مسلکی تعصب کا فتنہ

مولانا عبدالہادی العمری

رسول اکرم ﷺ نے اپنی امت کو مختلف قسم کے فتنوں سے متنبہ فرمایا، جن کا تعلق عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاقیات وغیرہ کے ساتھ ہے ۔ آپ ﷺ نے تو یہاں تک خبر دار کیا کہ ایک زمانہ آئے گا، فتنے اس کثرت سے رونما ہوں گے جیسے رات کی تاریکی میں بدلیاں چھانے لگتی ہیں:

«بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ فِتَنًا كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا، أَوْ يُمْسِي مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا، يَبِيعُ دِينَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا» (صحیح مسلم:18)

آدمی بہت تیزی سے اپنے عقائد، دین اور نظریات کا دنیا کی آسودگی کی خاطر سودا کرنے سے تک گریز نہیں کرے گا۔

اسلام افراط و تفریط سے پاک معتدل اور متوازن دین ہے، انتہا پسندی اور غلو معیوب اور ناپسند دیدہ صفات ہیں، اسلام کا ہر حکم رحمت اور برکت ہے۔ مشہور تابعی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اللہ وحدہ لاشریک کا بتایا ہوا راستہ افراط و تفریط سے پاک معتدل ہے۔"

امام ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"احکام الٰہی کی بجا آوری کی راہ میں شیطان یا سستی اور کاہلی کی طرف لے جائے گا، یا انتہاء پسندی کی طرف جبکہ اللہ کا دین وسط میں ہو گا۔ کوتاہی کرنے والے بھی گھاٹے میں ہوں گے اور انتہا پسند بھی خسارہ میں۔"(مدارج السالکین:2/496)

اگرچہ عبادات میں رغبت اور شوق آدمی کی صالحیت کی دلیل ہے، یہ جذبہ بجائے خود باعث سعادت ہے لیکن اسلام نے اس عمل خیر کی انجام دہی میں بھی اعتدال کی تعلیم دی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا اور صحابہ کو اس کی تلقین فرمایا کرتے، نوافل کی ادائیگی صوم اور صدقہ خیرات، بلکہ معمولات زندگی کھانے پینے چلنے پھرنے ، سونے جاگنے، پہننے اور اوڑھنے میں یہی حکم ہے۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک خاتون حاضر ہوئیں، جن کے چہرے مہرے سے بشاشت غائب تھی، کمزوری اور نقاہت کے آثار نمایاں تھے، رسول اکرم ﷺ نے استفسار فرمایا کہ کیا ماجرا ہے؟ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: کثرت شب بیداری کا یہ اثر ہے، یہ رات میں نہیں سوتیں۔ آپ ﷺ نے تاکید فرمائی کہ اپنی استطاعت کے مطابق عمل کیا کرو ، اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا، مگر تم خود ہی تھک ہار کر اکتا جاؤ گی۔ بارگاہ الٰہی میں پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر آدمی مداومت کر سکے۔

«عَلَيْكُمْ مَا تُطِيقُونَ مِنْ الْأَعْمَالِ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَمَلُّ حَتَّى تَمَلُّوا»(صحیح بخاری:1164)

امام بخاری نے اس حدیث کے لئے باب کا جو عنوان منتخب فرمایا ، وہی دراصل روح اسلام اور اصول عبادت ہے:

"باب مَا يُكْرَهُ مِنَ التَّشْدِيدِ فِي العِبَادَةِ"

یعنی عبادات میں سختی کی کراہیت ، حالانکہ عبادت تقرب الی اللہ کا ذریعہ، صالحیت کی علامت اور سعادت دارین کے حصول کا سبب ہے، لیکن اس میں بھی اعتدال مطلوب ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی مشہور حدیث کو یہاں ذہن میں رکھا جائے، جب تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے گھریلو معمولات دریافت کرنے کے بعد ایک نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ میں ہر رات سوئے بغیر قیام اللیل میں بسر کروں گا، دوسرے نے ہر روز نفل روزہ رکھنے کا فیصلہ کیا، اور تیسرے نے شادی بیاہ سے گریز کرنے کا عندیہ دیا تاکہ سارا وقت دین کی راہ میں لگا سکے۔ آپ ﷺ کو اس سے آگاہ کیا گیا، آپ نے ان کے فیصلے کو ناپسند کرتے ہوئے اپنی مثال پیش کی اور کہا اللہ کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، لیکن میں ہر دن روزہ نہیں رکھتا، پوری رات جاگ کر عبادت نہیں کرتا ، میں نے شادی کی، میری فیملی لائف بھی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ جو کوئی میری سنت سے اعراض کرے گا، اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یعنی جو اسوۂ نبوی کے برخلاف عبادت میں افراط و تفریط کا مظاہرہ کرے گا، اس کا آپ ﷺ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ (صحیح بخاری:5063؛ صحیح مسلم:3403)

آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جگہ جگہ اس کی تاکید فرمائی، جب آپ مزدلفہ پہنچے، اپنے چچازاد بھائی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جمرات کے لیے کنکریاں لانے کا حکم دیا، وہ لے آئے تو ان میں جو درمیانے سائز کی کنکریاں تھیں، وہ قبول کرتے ہوئے ایسی تاکید فرمائی کہ جس سے ہر طرح کے تشدد اور انتہاء پسندی کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ»(سنن ابن ماجہ:3029)

"اے لوگو! خبردار دین میں غلو سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو دین میں غلو ہی نے برباد کر ڈالا۔"

دینی مسائل میں غلو، مبالغہ آرائی اور اپنی آراء پر اصرار کے نقصانات ماضی میں کیا ہوئے، اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں تاکہ آج پیش آمدہ حالات، باہمی کشیدگی اور منافرت کو سمجھنے میں آسانی ہوسکے سب سے پہلا اور بڑا فتنہ خوارج کا تھا، جس کے متعلق مشہور تابعی وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اگر خوارج کو غلبہ حاصل ہوتا تو زمین میں فساد برپا ہوتا، امن وامان درہم برہم ہوتا، فریضہ حج متاثر ہوتا اور پھر سے اسلام کا معاملہ دور جاہلیت کی طرف لوٹ جاتا۔"(سیر اعلام النبلاء:4/554)

خوارج جنہوں نے امت مسلمہ کے بہترین لوگوں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خلاف خروج اور بغاوت کی۔(فتح الباری:12/283)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا:

"یہ وہ لوگ ہیں، جو مسلمانوں کے قتل کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے نظریات سے متفق نہیں ہوتا، ان کی جان ومال کے درپے ہوتے ہیں، ان کی تکفیر کرتے ہیں اور یہ سب کچھ اپنی جہالت اور گمراہی کے سبب دین سمجھ کر کرتے ہیں۔"(منہاج السنہ:5/248)

اس گروہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"آخر زمانہ میں کچھ ایسے نوجوان ہوں گے، جو ناسمجھ ہونگے، بظاہر بہترین باتیں کریں گے:

«سَيَخْرُجُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ أَحْدَاثُ الْأَسْنَانِ سُفَهَاءُ الْأَحْلَامِ» (صحیح بخاری: 3930؛ صحیح مسلم:2427)

یعنی وہ اپنی کم عقلی اور ناتجربہ کاری کے سبب فتنہ وفساد برپا کریں گے، بظاہر یہ لوگ قرآن مجید کی تلاوت تو کریں گے، صلاۃ وصوم کا اہتمام بھی کریں گے، لیکن یہ سب ان کے خلاف ہی جائے گا، ان کا طریقہ استدلال غلط ہوگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بہتر خود کو دین کا سمجھنے والا باور کریں گے۔

«يَخْرُجُ قَوْمٌ مِنْ أُمَّتِي يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ لَيْسَ قِرَاءَتُكُمْ إِلَى قِرَاءَتِهِمْ بِشَيْءٍ وَلَا صَلَاتُكُمْ إِلَى صَلَاتِهِمْ بِشَيْءٍ...» (صحیح مسلم:1066)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ قرآن مجید کی آیات کے حقیقی معنی ومراد کو چھوڑ کر من مانی تاویلات کیا کرتے، اور اپنی آراء پر اصرار کرتے اور اسی کو ترجیح دیتے۔(فتح الباری:12/283)

اگر ہم موجودہ چند تنظیموں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خارجی فکر کے جراثیم آج بھی موجود ہیں اور مسلم نوجوانوں کو خاص طور پر متاثر کر رہی ہیں، جیسے المہاجرون حزب التحریر ISISداعش وغیرہ وغیرہ، مختلف ممالک میں جزوی ناموں کی تبدیلی کے ساتھ یہی فکر اور نظریات کے افراد موجود ہیں، جو مسلمانوں کے درمیان انتشار اور افتراق کا سبب بن رہے ہیں، عرب ممالک میں داعش کے پرکشش نعروں نے بہت سے نوجوانوں کو اپنا گرویدہ بنالیا کہ حکومت اسلامیہ کا قیام، خلیفہ کی آمد اور ان کے ہاتھ پر بیعت، ایسی باتیں ہیں جن میں بلا کی کشش ہے اور پھر لوگ دیوانہ وار اس طرف چل پڑے۔ حالانکہ خلافت، خلیفہ، جہاد اور حکومت اسلامیہ کے خوبصورت دعوؤں کے متعلق موجودہ دور کے معتبر علماء کے متعدد بیانات آچکے ہیں کہ یہ اسلامی اصطلاحات ہیں، ان کا استعمال بھی اسلامی آداب کے مطابق ہونا چاہئے، ان میں سے ایک ممتاز عالم دین علامہ الشیخ عبد المحسن بن حمد العباد سابق وائس چانسلر مدینہ منورہ اسلامی یونیورسٹی کا بیان ہے، جو اس وقت دیا گیا، جب اکثر لوگ اس تنظیم کے فل فارم سے تک واقف نہیں تھے، اس میں نوجوانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ ان گمنام تنظیموں اور لوگوں کے پیچھے بھاگنے سے اجتناب کریں، ورنہ انہیں سوائے رنج و ملامت اور پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ عموماً کم عمر، ناتجربہ کار لوگ مخلص ہونے کے باوجود غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں، جیسے صحیح بخاری میں ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے ایک روایت کی ہے کہ جب وہ کم عمر تھے، انہوں نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سورہ بقرہ آیت نمبر 158 صفا اور مروہ کی سعی کے حوالے سے دریافت کیا کہ اگر سعی نہ بھی کی جائے تو آیت کے مطابق کوئی حرج نہیں، تو ام المؤمنین نے انہیں سمجھایا کہ آیت کا مفہوم وہ نہیں جو تم نے سمجھا، بلکہ اس کا ایک خاص پس منظر ہے، اس میں سعی کرنے کا حکم دیا گیا اور جنہیں زمانہ جاہلیت میں رائج بعض باتوں کے سبب تردد ہو رہا تھا، وہاں مشرکین جاکر شرکیہ عمل کرتے، انہیں تسلی دی گئی کہ تمہارا ارادہ وہ نہیں تم تو اللہ کا حکم بجالاتے ہوئے یہ عمل کر رہے ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عروہ بن زبیر رحمہ اللہ جو جو اونچے درجے کے تابعین میں شمار ہوتے ہیں، بچپن میں انہیں آیت کا مفہوم سمجھنے میں غلط فہمی ہوگئی لیکن اہل علم سے رجوع کے باعث اصلاح ہوئی۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم عمری اور ناتجربہ کاری میں غلط فہمی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اور اس کا درست طریقہ معتبر اہل علم سے رجوع کرنا ہے۔ ایک مثال صحیح مسلم کی سامنے رکھیے، یزید الفقیر کہتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں تھا، جو خوارج کے افکار سے متاثر تھے، ہمارا پلان تھا کہ حج کے لیے جائیں گے اور حج کے بعد لوگوں کی خبر لیں گے، لیکن جب مدینہ

منورہ پہنچے وہاں ان کی ملاقات مشہور صحابی سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ہوئی، ان سے گفتگو کے بعد کچھ غلط فہمیاں دور ہوئیں اور اپنے پلان سے باز آگئے۔(صحیح مسلم:191)

شرعی اصطلاحات کے معانی اور مفاہیم کو متعین کرنے میں کچھ لوگوں کو علمی لغزشیں ہوئیں، جیسے جہاد، کفر کا فتویٰ، فتنہ تکفیر، دوستی اور دشمنی کے پیمانے الولاء والبراء، ان اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے، اس کے احکامات اور مسائل کیا ہیں، ہونا تو یہ چاہیے کہ ان امور میں معتبر علماء ربانی سے رجوع کیا جاتا، لیکن عملاً ایسے نہیں ہوتا بلکہ نادانوں نے ثقہ علماء ہی کو مورد الزام ٹھہرانے کی جسارت کی، تجربہ کار قابل علماء کے بجائے ناتجربہ کار اور غیر معتبر لوگوں سے فتویٰ لینے لگے۔ انہوں نے اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے سبب ایسے فتوے دیئے، جس سے نہ خون محفوظ اور نہ عزت و آبرو، نہ حکمران محفوظ اور نہ ہی عوام۔ یوں وہ بھی گمراہ ہوئے اور ماننے والوں کو بھی گمراہ کیا۔

اس ضد اور انتہا پسندی کے باعث ماضی میں کلمہ گو مسلمانوں کے درمیان خوفناک جنگیں اور خون ریز لڑائیاں ہوئیں، دونوں طرف کلمہ گو مسلمان ہی تھے، اس میں ایک بڑا فتنہ مذہبی منافرت اور فرقہ واریت کا ہے، خیر القرون کے عہد زریں میں اس کے سنگین نقصانات ہوئے اور عجیب اتفاق کہ آج بھی مسلم دنیا اس سے محفوظ نہیں۔

اس منافرت اور مذہبی تعصب کے نقصانات اور فسوں کاریوں کو سمجھنے کے لئے ذیل کا ایک واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، جو عربی ادب کی اہم کتاب 'الکامل في اللغة و الادب للمبرد' میں سورہ توبہ کی آیت 6 کے ضمن میں مذکور ہے، اگرچہ یہ کتاب عربی ادب سے متعلق ہے لیکن اس میں دلچسپ واقعات بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

واصل بن عطاء المعتزلی (متوفیٰ 131ھ) اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے راستہ بھٹک گئے اور ایسی جگہ پہنچے جہاں خوارج کا بسیرا تھا، واصل نہایت زیرک اور فصیح اللسان تھے، وہ خطرہ بھانپ گئے کہ اگر ہم بطور مسلمان خوارج کے سامنے پیش ہوں گے، خدشہ ہے کہ سب مارے جائیں گے، لہٰذا اپنے رفقاء سے کہا کہ گفتگو صرف میں کروں گا، تم سب کی جانب سے، پھر خود خوارج کے سامنے اس انداز میں پیش ہوئے گویا غیر مسلم ہیں، جو دین سیکھنے کی غرض سے حاضر خدمت ہیں اور سورہ توبہ کی مذکورہ آیت پڑھی، خارجیوں نے باہمی مشورہ کیا کہ قرآن کی آیت برحق ہے کہ کوئی مشرک پناہ طلب کرے تو دے دو تاکہ وہ دین سیکھ سکے، پھر خواج نے چند مسلمات دین پیش کیے، واصل ایک فرمانبردار کے روپ میں کہتے کہ یہ باتیں مجھے اور میرے رفقاء کو منظور ہیں، ہم قبول کرتے ہیں اور جب ساری باتیں ہوگئیں انہوں نے کہا کہ پھر آپ جاسکتے ہو، یعنی پروانہ امن مل گیا، واصل نے کہا کہ آپ کی ذمہ داری ابھی پوری نہیں ہوئی، آیت کے آخری حصے پر عمل آپ کے ذمہ باقی ہے کہ سائل کو محفوظ ٹھکانے تک پہنچاؤ، انہوں نے کہا، بلاشبہ آیت برحق ہے ہم یہ ذمہ داری پوری کیے دیتے ہیں اور انہیں ان کے راستے پر چھوڑ آئے۔

اس واقعہ کے مختلف پہلو ہیں، ایک یہ کہ اگر واصل اور رفقاء بطور مسلمان خوارج کے سامنے پیش ہوتے تو شاید قتل کر دیئے جاتے یا سخت اذیت ناک صورتحال سے دوچار ہوتے، کیونکہ بعض مسائل میں اختلاف تھا، غیر مسلم کا روپ اختیار کرکے مامون بھی رہے اور بسلامت منزل تک پہنچ بھی گئے۔

ایسے تلخ واقعات صرف ماضی کا حصہ نہیں، آج بھی اس کے جراثیم موجود ہیں، افغانستان پہلے سوویت یونین رشیا سے پھر امریکی تسلط سے آزاد ہوا تو وہاں بظاہر مسلمانوں کی حکمرانی بحال ہوئی اور پھر قلیل عرصہ میں دسیوں مسلمان علماء اور شخصیات کو جو فقہی چند مسائل میں مختلف رائے رکھتے تھے، نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا، حالانکہ قاتل اور مقتول دونوں ہی ایک دین کو ماننے والے تھے، یوں مقتولین کے لیے روس اور امریکی تسلط کا دور سلوک کے اعتبار سے مقتولین کے حق میں بہتر تھا کہ انہیں اپنے مسلکی اور فقہی رجحان کے مطابق عمل کرنے کی آزادی تھی۔ اور ان کی یہ آزادی کلمہ گو مسلمان حکمرانوں کی جانب سے چھین لی گئی اور مختلف رائے رکھنے والوں کی بڑی تعداد کو یا قتل کر دیا گیا یا ان کے لیے زمین تنگ کی جارہی ہے۔

ایران کے دارالحکومت تہران میں آج بھی اہل سنت کی ایک مسجد نہیں، سنیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہاں شیعی امام کی اقتداء میں نماز جمعہ اور دیگر نمازیں ادا کریں، جبکہ اسی تہران میں کنیساؤں اور گرجا گھروں کی کمی نہیں۔

عراق میں صدام حسین کے بعد ہزاروں سنیوں کو شیعی ذمہ داروں کی جانب سے قتل کر دیا گیا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

شام میں نصیری حکمرانوں کی جانب سے سینکڑوں مسلمانوں کو اذیت ناک سزاؤں کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، پاکستان میں گذشتہ بڑی مساجد کے باہر مسلح پہرے داروں کو متعین کرنا پڑا کہ عبادت گزاروں کی حفاظت کر سکیں، مبادا ان پر کوئی اس وقت حملہ نہ کر دے جب حالت سجدہ میں ہوں، کیونکہ مساجد اور عبادت گاہوں پر متعدد حملے اور وارداتیں ہوچکے ہیں، قاتل اور مقتول دونوں ہی خود کو مسلمان کہتے اور باور کرواتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں سال گذشتہ ایک ہی جماعت کے دو

گروہوں میں سالانہ تبلیغی اجتماع کے موقع پر خون ریز لڑائیاں ہوئیں، جن میں متعدد مسلمان مارے گئے، آپس میں اختلاف تھا تو تنظیمی اور شخصی نوعیت کا، کل تک جو دوسروں کو اکرام مسلم کا درس دے رہے تھے، آج ان کے ہی ہاتھوں سے اپنے بھائی زخمی ہونے لگے اور اس چپقلش کی متعدد مثالیں ہندوستان کے مختلف شہروں اور قریوں میں بھی دیکھی جا رہی ہیں۔ آج بھی بعض نام نہاد دینی پیشواؤں کی جانب سے زائرین حرمین کو تاکید کی جاتی ہے کہ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے ائمہ کے پیچھے تمہاری نمازیں درست نہیں ہوتیں، لہٰذا ان کی اقتداء میں نماز نہ ادا کی جائے!!

بعض اوقات میدان عرفات کے دن ظہر اور عصر کی ادائیگی کی بابت مختلف حجاج کے خیموں میں لڑائیاں عام سی بات ہے، حتیٰ کہ حالت احرام میں بھی دست درازی سے تک گریز نہیں کرتے، مسئلہ افضلیت کے تعین کا ہوتا ہے کہ قصر اور جمع افضل ہے یا اتمام۔

اور بعض مساجد کے باب الداخلہ پر ہی تختی آویزاں ہوتی ہے کہ مسجد میں فلاں اور فلاں نظریہ کے حاملین کا داخلہ منع ہے۔ کیا آج کا یہ انداز واصل بن عطاء اور خارجیوں کے مذکورہ واقعہ سے مشابہت نہیں رکھتا! اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ممنوعہ مساجد، مدارس یا اسلامی مراکز میں اگر کوئی غیر مسلم لیڈر یا سماجی شخص آئے تو یہی رہنما اس کا گاڑی سے استقبال کرکے مسجد یا مدرسہ یا اسلامی مرکز میں لے آتے ہیں اور اسی احترام کے ساتھ اسے گاڑی تک چھوڑ آتے ہیں۔

دینی مدارس کے فارغین اور علماء سے بجاطور پر اُمید کی جاتی ہے کہ وہ ان مسلکی تلخیوں کی شدت کم کرکے اتحاد امت اور مختلف تنظیموں کے درمیان تقارب کی کوشش کریں گے، کیونکہ مدارس اسلامیہ کے اساتذہ اور طلبہ کا یہ پسندیدہ عنوان ہے، لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' کچھ عرصہ سے سوشل میڈیا کے ذریعہ عام ہونے والی گفتگو اور انداز بتا رہا ہے کہ قوم کو جن فضلاء مدارس سے توقع تھی کہ وہ معمار کا کردار ادا کریں گے، لیکن افسوس کہ وہی بگاڑ اور فساد کی آگ بھڑکا رہے ہیں، ایک دوسرے کے خلاف ان کی گفتگو اور نشتر زنی سے کون ناواقف ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان نوجوان فارغین اور ناتجربہ کار خطباء کا نشانہ خود ان کے ہی بھائی بند ہیں، اور لطیفہ یہ کہ ان کے درمیان زیر بحث مسائل عموماً اجتہادی نوعیت کے ہوتے ہیں، جن میں زیادہ سے زیادہ بحث کا محور افضل اور مفضول یا راجح اور مرجوح کا ہوتا ہے۔ اسی طرح معیار حق و باطل یہ گھڑ لیا گیا کہ کسی نے ایسے کسی عالم یا مصنف کی کوئی کتاب پڑھنے کا مشورہ دے دیا، جو ان ناقدین کی نظروں میں بعض مسائل میں ان سے مختلف رائے رکھتے ہیں، گویا کسی مصنف یا عالم کے ساتھ کسی مسئلہ میں اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کوئی بات چاہے وہ کتنی ہی درست اور مبنی بر حقیقت ہو، قابل قبول نہیں، جبکہ اس مصنف کو مسلمان ہی کہا، سمجھا جاتا ہے اور ایک دوسرے کی درسگاہوں کا یا ان میں برسر خدمت علماء کرام کا نام تک احترام سے لینا گوارہ نہیں، کیا یہی اتحاد امت کا نمونہ ہے، جس کا ہر جلسہ اور محفل میں شور مچایا جاتا ہے، کیا یہی سلف صالحین کا اسلوب تھا، امام شافعی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ کسی مسئلہ میں یونس صدفی سے بحث کی، مجلس ختم ہوگئی جب دوبارہ ملاقات ان کے ساتھ ہوئی تو امام عالی مقام نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور کہا کہ ہمارے لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ کسی مسئلہ میں اختلاف رائے کے باوجود باہمی اخوت برقرار رکھیں، امام شافعی کے انتقال کی خبر جب امام احمد بن حنبل کو ہوئی وہ تڑپ کر ایسے روئے کہ ان کے فرزند کو سبب دریافت کرنا پڑا، امام احمد نے فرمایا: '' آج علم کا سورج غروب ہوگیا، میرا عرصہ سے معمول تھا کہ ان کے درجات کی بلندی کی دعا کرکے سویا کرتا۔''

مسائل میں اختلاف کے باوجود الفت اور محبت ہمارے لیے غور طلب ہے، علماء مدارس کے لیے امام مالک کا یہ فرمان کتنا چشم کشا ہے کہ

"كل منا يؤخذ ويرد إلا صاحب هذا القبر."

''ہم میں سے ہر ایک کی کچھ باتیں قبول بھی کی جاسکتی ہیں اور ترک بھی کی جاسکتی ہیں، اس سے استثناء حاصل ہے تو صرف رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے۔''

آج اس کی عملی مثال دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کا اسلوب نہایت غور طلب ہے کہ وہ حدیث ذکر کرکے اس کے مطابق فتوی دینے والے اہل علم کے اسماء گرامی بھی ذکر کردیتے ہیں کہ میں نے جو حدیث منتخب کی ہے، اس باب کے لیئے اس میں میرے علاوہ اور بھی اہل علم شامل ہیں اور بعض اوقات دوسری رائے رکھنے والوں کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ زیر بحث مسئلہ میں اس کے سوا بھی رائے ہے۔ یہی کتاب دینی مدارس کے نصاب میں دیگر کتب حدیث کے ساتھ پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، لیکن امام ترمذی کی سیرت و کردار اور مختلف رائے رکھنے والوں کا نام تک ہمارے لیے قابل احترام نہیں اور بعض نوخیز فارغین تو عوام کو اس بات سے منع کرتے ہیں کہ ان کی یہ بات نہ سنی جائے، نہ ہی مجلس میں شرکت کی جائے، کیا یہی محدثانہ شان اور عالمانہ مزاج ہے، اور پھر جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام سوشیل میڈیا کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے، ہر صف اور گروہ کے ساتھ مریدین باصفا کی کمی نہیں جو علماء اور خطباء کی مثبت اور ٹھوس باتوں کی طرف توجہ کم دیتے

ہیں، لیکن منفی اور ترش و تند باتوں کو ہوا کے دوش پر پھیلا کر بزعم خود فرض کفایہ ادا کرتے ہیں۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بعض احباب کے متعلق دریافت کیا گیا جو ان کے مخالف کیمپ میں شامل تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جن الفاظ میں ان مخالف حضرات کا ذکر کیا کہ اسے حرز جان بنانا چاہیے، جو اختلافات کی چلچلاتی دھوپ میں احترام اور مودت کی ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتی ہے۔

" اخواننا بغوا علينا " (سنن بیہقی:8/173)

وہ بھی ہمارے ہی بھائی بند ہیں، لیکن ہمارے خلاف انہوں نے چڑھائی کی، ان میں سے چند کا ذکر کر کے کہا کہ ہم سب جنت میں ہوں گے۔ ان شاءاللہ

پھر سورہ اعراف کی آیت 43 پڑھی:

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ﴾

دینی مدارس، تنظیموں اور اسلامی مراکز کے درمیان محبت اور مروت کا رشتہ باقی رکھنے کے لیے امام ابن قیم کی کتاب اعلام الموقعين اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی الانصاف في بيان سبب الاختلاف کا مطالعہ اہمیت رکھتا ہے، گو کہ اس عنوان پر متعدد کتابیں موجود ہیں، لیکن ان دونوں ہستیوں کو ہمارے ہاں ہر حلقہ میں بوجوہ پذیرائی حاصل ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے سلف صالحین کے عہد زرین میں اختلاف کی شدت کی کمی کا ایک سبب یہ بتایا کہ وہ اولو العزم ہستیاں تقوی اور خلوص کا پیکر تھیں، وہ خواہشات نفس اور جذبات سے بلند ہو کر مسائل پر غور کرنے کے عادی تھے اور جب بھی حق واضح ہوتا، اس کی قبولیت میں انہیں ادنی درجہ کا تردد نہیں ہوتا۔

اس دور میں عقیدہ کی پختگی کو اہمیت حاصل تھی اور اعمال میں اعتدال، علماء کا احترام تو تھا لیکن شخصیت پرستی اور غلو نہیں، اجتہاد اور استنباط کی قدر تو تھی لیکن محور اور اساس کتاب وسنت تھی۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا﴾ (سورة النساء:135)

”خواہش نفس کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ دینا۔“

ماضی میں وجود میں آنے والے مختلف فرقوں اور مسالک ان کے درمیان تلخیوں کا ایک اہم سبب حقیقی علم اور علماء ربانی سے دوری تھا اور عجیب اتفاق کہ یہی سبب آج بھی دانشوروں اور نوخیز علماء میں دیکھنے میں آرہا ہے، تکبر اور معلوماتی عجب کے مختلف انداز اور اسالیب ہیں، ان میں ایک خود کو دوسروں سے بڑا عالم اور دانشور باور کر لینا ہے، یہ دور حاضر کا ایک بڑا فتنہ ہے، بعض لوگ جو مذہبی رہنماؤں کے طور پر میڈیا میں پیش پیش رہتے ہیں یا انہیں رکھا جاتا ہے، عوام میں ان کی دانشوری کی شہرت ہے، ان کی بے احتیاطی اور علمی پندار کا یہ عالم کہ دینی مسائل میں گفتگو کرتے ہوئے وہ ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں گویا ان پر وحی کا نزول ہو رہا ہے، ان کی گفتگو قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے ذکر سے یکسر خالی ہوتی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ سلف صالحین خصوصاً صحابہ کرام اور تابعین عظام کا تذکرہ بھی اپنی کسر شان سمجھتے ہیں، حالانکہ انہیں اس حقیقت کا اتنا تو ادراک ہونا چاہیے کہ شرعی احکام ان پر نازل نہیں ہوئے، دین اللہ کے آخری نبی ﷺ پر مکمل ہوا اور حضرات صحابہ براہ راست نبی کریم ﷺ سے ساعت کر رہے تھے، ان کے سینے انوار رسالت ﷺ کی کرنوں سے منور ہو رہے تھے، پھر ان سے تابعین نے مسائل سیکھے اور سمجھے، پیش آمدہ مسائل میں وہاں سے ہمارے لیے کیا رہنمائی مل رہی ہے، انہوں نے ان مسائل کا کیا حل تجویز فرمایا، دین فہمی کی بنیاد قرآن و سنت ہے انہیں ہم سے زیادہ قرآن وسنت پر دسترس حاصل تھی، ان بزرگوں کو نظر انداز کر کے اپنی رائے سے گفتگو کا آغاز بجائے خود گمراہی ہے، چاہے عوام کتنا ہی انہیں دانشور اور مفکر سمجھیں اور دوسری طرف کچھ ایسے معاصر علماء اور خطباء ہیں، جو اپنی فکر اور نظریات کو عین قرآن و سنت قرار دیتے ہیں، وہ قرآنی آیات کو پیش کر کے ان کا مفہوم اس انداز سے کرتے ہیں، جیسے یہی قرآن ہے اور فرمان الٰہی ہے، علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ نصوص پیش کر کے پھر اپنی بات کریں کہ میں نے اس کا یہ مفہوم سمجھا ہے، یعنی ذاتی افکار اور رجحانات کو بطور قرآن نہ پیش کریں، بعض معاصر اہل علم نے قرآن مجید کی تفسیر اور تفہیم میں بھی یہی غلطی اور بے احتیاطی کی ہے، کہ جگہ جگہ اپنے نظریات آیات کے اندر ٹھونسنے کی جسارت کی ہے، جو روح قرآن اور اسلوب سلف کے منافی ہے۔ پھر ان کے معتقدین اور وابستگان اس شدت سے ان نظریات کا پرچار کرتے ہیں کہ اس کے علاوہ دوسری کوئی رائے یا نظریہ ہی درست نہیں۔ غرض مذہبی مسلکی اور تنظیمی تعصب افسوسناک ہے، ماضی میں بھی اس کے تلخ نتائج نکلے اور آج بھی امت اس سے دوچار ہے۔

دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اللہ بگاڑ کے حقیقی عوامل سمجھنے اور درست علاج کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”کثرت سے لا إله إلا الله پڑھا کرو، کیونکہ یہ ایسے الفاظ ہیں جو صرف زبان کی حرکت سے ادا ہو جاتے ہیں، ہونٹوں کی حرکت کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے ساتھ بیٹھنے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔“

(التلخيص لوجوہ التخليص:1/100)



حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کی زیادتیاں

(قسط 03)

مولانا محمد عبدالحفیظ اسلامی

اس سلسلہ میں سورہ طٰہٰ کی آیات 86 تا 98 پر غور کیا جائے تو ہمیں مزید معلوم ہو گا کہ بنی اسرائیل ایک ایسی قوم گذری ہے جو اپنے رسول کی ہر وقت نافرمانیاں کیا کرتی رہیں اور آپ کے معاون حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی مشرکانہ عمل "گاو سالہ پرستی" (Cow Worship) سے روکنے کی پاداش میں سختی سے پیش آئی۔ لاکھ سمجھانے سے بھی نہ رکی اور شرک کی گندگی میں مبتلا ہوگئی، جس کے لئے اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے حضرت ہارون علیہ السلام کو جوابدہی کرنی پڑی تھی! کیونکہ، حضرت موسیٰؑ نے جب کوہ طور پر (اللہ تعالیٰ کے احکامات، حق و باطل میں فرق کرکے دکھلانے والی تحریریں،) اپنے رب کی بندگی کے طور طریقہ لانے کے لئے 30 دن اور مزید 10 دن' چالیس دنوں کے لئے تشریف لے گئے تھے تب انہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا جانشین بنایا۔ لیکن واپس آنے پر اپنی قوم کو دیکھا کہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصہ کے عالم میں اپنے جانشین بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے اور (نرمی کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوے اے میرے "ماجائے" Brother born of the same mothar کہ کر) باز پرس کرنے لگے۔ اس طرح یہ قوم "بنی اسرائیل" ہمیشہ اپنے انبیاء کو دکھ دیتی رہی اور انکی اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ اپنے محسن ونجات دہندہ رہنما و رہبر کی عجیب قسم کی توہین کرنے کی مرتکب ہوئی۔ قارئین کرام مضمون ہذا کے اصل عنوان کا آغاز جس آیت کریمہ سے ہوا وہ سورۃ احزاب کی آیت 69 ہے جو قسط اول کے ابتداء میں ہی درج کی جاچکی ہے جس کی یہاں صرف ترجمانی بطور یاددہانی پیش کی جاتی ہے۔ فرمایا:

"اے ایمان والو! نہ بن جانا اُن (بدبختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ کو ستایا۔ پس بری کردیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اس سے جو انہوں نے کہا، اور آپ اللہ کے نزدیک بڑے شان والے تھے۔" (ترجمہ از کرم شاہؒ آیت 69)

چنانچہ؛ترجمانِ حق کا مذاق اڑانا' استہزا کرنا' داعی حق کی ہجو کرنا' معاشرے میں بدنام کرنا' عیب نکالنا وغیرہ یہ سب ابلیس لعین کی ذریت کے مشاغل رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے حبیب و خیر خواہ کو دشمن سمجھنا اور اس کی باتوں پر دھیان نہ دینا یہ سب چیزیں بدنصیبوں اور بدبختوں کی صفات ہیں۔

آیت مذکور 69 (الاحزاب) کی تفسیر کے تحت ایک حدیث یوں آئی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت باحیا تھے، چنانچہ اپنا جسم انہوں نے کبھی لوگوں کے سامنے ننگا نہیں کیا۔ بنو اسرائیل کہنے لگے کہ شاید موسیٰؑ کے جسم میں برص کے داغ یا کوئی اس قسم کی آفت ہے جس کی وجہ سے یہ ہر وقت لباس میں ڈھکا چھپا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ تنہائی میں غسل کرنے لگے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیئے۔ پتھر (اللہ کے حکم سے) کپڑے لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے دوڑے' حتیٰ کہ بنی اسرائیل کی ایک مجلس میں پہنچ گئے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ننگا دیکھا تو ان کے سارے شبہات (جو بدبختوں کی طرف سے معاشرے میں پیدا کردیئے گئے تھے۔ (مرتب، دور ہوگئے۔)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نہایت حسین و جمیل اور ہر قسم کے داغ اور عیب سے پاک تھے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر پتھر کے ذریعے سے ان کے اس الزام اور شبہے سے برأت کردی جو بنی اسرائیل کی طرف سے ان پر کیا جاتا تھا۔

(صحیح بخاری، کتاب الانبیاء بحوالہ القرآن الکریم وترجمہ معانیہ و تفسیر: ص1194 تا 1195 از مولانا حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لفنگے واوباش لوگوں کے غلط پروپگنڈے کا رد فرما دیا جو حضرت موسیٰؑ کے دل کو دکھانے کا باعث بنا ہوا تھا۔

جو لوگ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستایا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی، ہر عیب سے نفی فرمادی اور آپ کی شان میں مزید یہ فرمایا کہ

﴿وکان عند اللہ وجیھاً﴾ اور موسیٰ اللہ کے یہاں آبرو والا ہے، یعنی یہ لوگ آپ کی قدر منزلت نہیں جانتے لیکن اللہ تبارک تعالیٰ کے نزدیک آپ کی شان بلند ہے۔! یعنی صاحب منزلت اور مستجاب الدعوات

مولانا مفتی شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے ابن کثیرؒ کے حوالہ سے اس سلسلہ میں یوں تحریر فرمایا ہے؛ یعنی "تھے موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نزدیک صاحبِ وجاہت۔" اللہ کے نزدیک کسی کی وجاہت اور جاہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرمائیں اس کی خواہش کو رد نہ کریں۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مستجاب الدعوات ہونا قرآن میں ان واقعات کثیرہ سے ثابت ہے جن میں انہوں نے کسی چیز کی دعا مانگی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح قبول فرمایا، ان میں سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام کو پیغمبر بنانے کی دعاء کی اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان کو موسیٰؑ کے ساتھ شریک رسالت بنا دیا۔ حالانکہ منصب نبوت کسی کو کسی سفارش پر نہیں دیا جاتا۔(حوالہ معارف القرآن:7/240، سورۃ الاحزاب)

یہ تھی مختصر سی داستان جو بنی اسرائیل نے اپنے انبیاء کو دکھ دیا، تکلیف پہنچائی اور اذیتیں دیا کرتے تھے۔ اب ایمان والوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا حوالہ دے کر بتایا جارہا ہے کہ تم ہرگز ان کی روش اختیار کرکے اپنے کو اللہ کے غضب کا مستحق نہ بنالو ورنہ نجات کے سارے باب تم پر بند ہو جائیں گے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے "یاایھا الذین آمنوا" کے سلسلہ میں یوں رقم طراز ہوئے "یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قرآن مجید میں اے لوگو جو ایمان لائے ہو' کے الفاظ سے کہیں تو سچے اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے، اور کہیں مسلمانوں کی جماعت بحیثیت مجموعی مخاطب ہے جس میں مومن اور منافق اور ضعیف الایمان سب شامل ہیں، اور کہیں رُوئے سخن خالص منافقین ہی کی طرف ہے۔ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو الذین آمنوا کہہ کر جب مخاطب کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ان کو شرم دلانا ہوتا ہے کہ تم لوگ دعویٰ تو ایمان لانے کا کرتے ہو اور حرکتیں تمہاری یہ کچھ ہیں۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے ہر جگہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ الذین آمنوا سے مراد کون لوگ ہیں۔ یہاں سلسلہ کلام صاف بتارہا ہے کہ مخاطب عام مسلمان ہیں۔(تفہیم القرآن:4/134)

نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی بابرکت بالعموم سارے انسانوں کیلئے محسن کی حیثیت رکھتی ہے اور بالخصوص اہل ایمان کیلئے تو رؤف اور رحیم ہے، لہٰذا اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ بنی اسرائیل کی محسن کُشی کا رویہ ہرگز نہ اپنائیں۔

سید مودودیؒ نے اس ضمن میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے۔ یہ بات متعدد مواقع پر خود نبی ﷺ نے بھی ارشاد فرمائی ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ نبی ﷺ مسلمانوں میں کچھ مال تقسیم کررہے تھے۔ اس مجلس سے جب لوگ باہر نکلے تو ایک شخص نے کہا "محمد نے اس تقسیم میں خدا اور آخرت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا۔"

یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سن لی اور جاکر حضور ﷺ سے عرض کیا کہ آج آپ ﷺ پر یہ باتیں بنائی گئی ہیں۔ آپ نے جواب فرمایا:

«يَرْحَمُ اللهُ مُوسَى، قَدْ أُوذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هَذَا فَصَبَرَ»

"اللہ کی رحمت ہو موسیٰؑ پر انہیں اس سے زیادہ اذیتیں دی گئیں اور انہوں نے صبر کیا۔"(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، تفہیم القرآن)

حاصل کلام اور لمحہ فکر

آج ہم بحیثیت مسلمان نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہوئے کتنا کچھ آپؐ کے فرامین کی توہین کرتے ہیں اس پر ہمیں خوب غور فکر کرنے کی ضرورت ہے، اور اس بات پر بھی سنجیدہ طور پر جائزہ لینا ہوگا کہ آج ہمارے اکثر بھائی (الاماشاءاللہ) کتاب و سنت کی خالص تعلیمات اور روش صحابہؓ کی جگہ کس طرح اپنی من پسند "شخصیات" کی باتوں اور غیر مسنون چیزوں (بدعات) کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ سے والہانہ محبت شرط ایمان ہے، اس کے لئے ہمیں اپنی شب و روز کی زندگی میں عملی ثبوت فراہم کرنے ہیں، جس کے بغیر آپؐ سے محبت کے دعوے صرف دعوے ہی ہوں گے، ہمارا ایمان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آپ ﷺ سے ایسی محبت ہو جو دنیا کی ہر چیز سے بالاتر ہو یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ ہو، کیونکہ جب تک آدمی کامل مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی ہر عزیز تر چیز نبی مکرم ہادی عالمؐ پر نچھاور نہ کردے۔ حُبِ نبوی ﷺ دین کی بنیاد ہے۔ سورۃ توبہ آیت 24 میں پوری وضاحت کردی گئی کہ اللہ تعالیٰ سے اور رسول ﷺ اور دین اسلام سے والہانہ محبت ایک بندے مومن کیلئے انتہائی ضروری ہے۔ والدین، مال و دولت، بیوی بچے اور اپنے خاندان و قبیلے، ان سب کی محبت انسانی فطرت میں اللہ نے رکھی ہے، لیکن آیت بالا مذکورہ میں ان چیزوں کی نفی نہیں کی گئی بلکہ تقاضا اس بات کا کیا جارہا ہے کہ ان سب چیزوں کی انسیت و محبت سے زیادہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ اور دین اسلام سے محبت ہونی چاہیے، اگر اس طرح کی محبت ہماری زندگی میں نہ ہو تو پھر خواہ، ہمارا نام مسلمان کی حیثیت سے سرکاری رجسٹر میں درج رہے لیکن، ہم اللہ کی ناراضگی اور اس کی سخت وعید کے مستحق بن جاتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات و فرامین سے روگردانی کرتے ہیں اور آپؐ کے اُسوہ حسنہ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ کو اور اس کے رسول کو اپنا محبوب نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کے متعلق بتایا گیا کہ یہ فسق و گناہ میں مبتلا اور راہ حق سے ہٹے ہوئے اور ہدایت الٰہی سے محروم ہیں۔ نبی کریم ﷺ سے اہل ایمان کی محبت کس درجہ اہم ہے، احادیث میں بتادیا گیا ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے

قبضہ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والدین اور اس کی اولاد سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" (صحیح بخاری)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے اہل وعیال، اس کے مال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔" (صحیح بخاری)

اسی طرح ایک اور روایت ہمارے سامنے آتی ہے: سیدنا عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ اس طرح نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں سوائے میرے نفس کے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "نہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے یہاں تک کہ میں تمہارے نزدیک تمہارے نفس سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں۔" یعنی اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں تمہارے نزدیک تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔"

زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی تھی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "ہاں! اللہ کی قسم 'اب آپ مجھے اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: "ہاں اب اے عمر" یعنی اب تمہارا ایمان مکمل ہوا۔ (صحیح بخاری)

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ لوگوں کی محبت کیسی ہوتی تھی؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اللہ کی قسم! رسول اللہ ہمیں مال و اولاد اور ہمارے ماں باپ سے زیادہ محبوب تھے اور اس سے زیادہ محبوب تھے جتنا کہ شدید پیاس کے وقت ٹھنڈا پانی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمیں دو "عاشق صادق" کے واقعات بھی کتب اسلامی میں ملتے ہیں۔

حضرت خبیب بن عدیؓ دھوکے سے مشرکین مکہ کے نرغے میں آگئے اور آپ کے ساتھ حضرت زید بن دثنہؓ بھی گرفتار ہو کر مکہ لائے گئے، ان دونوں صحابہؓ کو مشرکین مکہ میں سے ان لوگوں نے خریدا تھا جن کے باپ جنگ بدر میں واصل جہنم ہوئے تھے۔ ان کے خریدنے کا مقصد یہ تھا کہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ ان صادقین سے لیا جائے۔ چنانچہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو عقبہ بن حارث نے خریدا تا کہ اپنے باپ حارث بن عامر بن نوفل کے قتل کا بدلہ لے سکے، اور دثنہ بن زید رضی اللہ عنہ کو صفوان بن امیہ نے خریدا تا کہ اپنے باپ امیہ بن خلف کا بدلہ لے سکے۔ پہلے تو ان قیدیوں کو بھوکا پیاسہ رکھا گیا اور ہر طرح سے ان کا عرصہ حیات تنگ کیا، لیکن ان کے ایمان کی مضبوطی سے اللہ کی رحمت کو جوش آیا اور انہیں اپنے خزانہ غیب سے تازہ پھل کھانے کے لئے عطا فرماتا رہا۔ اور جب سولی پر چڑھانے کا وقت آیا تو حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کو اس مقام پر جہاں اب مسجد تنعیم واقع ہے کی جانب شمال چند سو قدم پر لے جایا گیا جہاں پر پھانسی کا پھندہ لٹکایا گیا تھا۔ ایک بڑا مجمع اس وقت جمع ہو گیا، سولی پر چڑھنے سے قبل حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے دو رکعت نماز نفل ادا فرمائی پھر اس کے بعد چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور ظالموں کے اس منظر کو دیکھ کر دعا فرمائی کہ اے میرے رب یہاں کوئی ایسا نہیں جو کہ میرا سلام تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم تک اور صحابہ تک پہنچادے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک آپ کے سلام کو پہنچادیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس واقعہ کی خبر پہنچادی۔ یہ تھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کرنے والے اپنی جان اللہ کے دین کیلئے قربان کرنے والے، لیکن اپنے نبی رحمت کے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ جانا بھی منظور نہیں تھا انہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں ہم صادق الایمان اور محبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

الغرض ہم سورہ الاحزاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ نے دین کی خاطر کتنی کچھ قربانیاں پیش کی ہیں اور ضعیف الایمان مسلمانوں اور منافقین کی طرف سے کیا کچھ اذیتیں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی گئی ہیں اور یہود کی طرف سے دی جانی والی تکالیف کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح حکمت کے ساتھ برداشت کیا ہے۔۔۔

(اب ہمارے لیے اس میں نصیحت کیا ہے؟)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کا ذکر کرتے ہوئے عام مسلمانوں کو یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ تم ہمارے پیغمبر آخر الزماں ہادی عالم، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کی طرح ایذا مت پہنچاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بابت ایسی باتیں مت بناؤ جسے سن کر آپ کو اضطراب محسوس ہو۔ خبردار! ورنہ اسی انجام سے دوچار ہوگے جس انجام سے بنی اسرائیل دوچار ہوچکے۔ (ختم شد)

☆☆☆

عبد الرحمن بن أبزى الخزاعي رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "نیک عورت مرد کے لیے ایسی ہے، جیسے بادشاہ کے سر پر سونے سے سجا ہوا خوبصورت تاج ہو۔" (مصنف ابن أبي شيبة: 3/559؛ رقم: 17143)



بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا 0 وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ﴾ (سورة الأحزاب: 45-46)

ہر قسم کی تعریف اور ہر طرح کا شکر اللہ کے لیے، اللہ کی ذات کے لیے جو مالک الملک ہے، خالق کل ہے ۔درود و سلام، صلاۃ و تسلیم، سرور انبیاء کے لیے جو انسانوں میں مؤمن کل اور رحمتِ کل ہیں۔

خطبہ مسنونہ کے ساتھ ابھی میں نے قرآن کریم کی جو آیات بینات پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ جن میں نبی اکرم ﷺ ہی کی شان اقدس اور اس کے ساتھ بحیثیت نبی آپ کے وہ فرائض اور آپ کی وہ ڈیوٹیاں جو آپ کے ذمے اللہ نے لگائیں، ان کا ذکر فرمایا کہ اے نبی! ہم نے آپ کو اپنی ہستی، اپنی توحید، آخرت اور غیبی حقائق کا گواہ بنا کر بھیجا ہے۔

﴿ وَمُبَشِّرًا ﴾خوشخبریاں دینے والا بنا کے بھیجا۔

﴿ وَنَذِيرًا ﴾اللہ کے عذاب اور سزا سے ڈرانے والا بنا کے بھیجا ہے۔

﴿ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ﴾ (سورة الأحزاب: 46)

اللہ کے حکم سے آپ اس کی طرف بلانے والے ہیں۔ یہ آپ کی حیثیت ہے، یہ آپ کی شان ہے اور پھر آخر میں فرمایا:

﴿وَسِرَاجًا مُّنِيرًا﴾ (سورة الأحزاب: 46)

اور ہم نے آپ کو ایک چمکدار چمکتا ہوا سورج بنا کے بھیجا ہے۔انہی آخری الفاظ پہ آج ان شاءاللہ بات کریں گے۔ آسمان پر ستارے بہت ہیں، ان میں ایک چاند روشن بھی ہے، لیکن روشنی آتی ہے اور اندھیرا دور ہوتا ہے تو سورج سے۔ اندھیرے کو سورج دور کرتا ہے۔ستارے اور چاند اتنے روشن نہیں ہیں، جتنا سورج ہے، جیسا کہ مشہور اور ایک معروف تفسیر کشاف میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ آپ کو سراج منیر کیوں کہا گیا؟

" جَلَّ بِهِ الظُّلُمَاتُ، وَاهْتَدَى بِهِ الضَّالُّونَ"

(تفسیر کشاف:547/3)

آپ کے آنے سے، آپ کی نبوت سے، آپ کے فیض سے شرک کے اندھیرے دور ہوئے اور گمراہوں نے ہدایت کی راہ پائی، جس طرح رات کا اندھیرا چمکتے ہوئے سورج سے دور ہو جاتا ہے۔ جیسے " كَمَا يُجَلُّ ظَلَامَ اللَّيْلِ" (تفسیر کشاف:547/3)

شرک، توہمات، کفراور بری رسوم وغیرہ کے اندھیرے آپ نے آ کر دور فرمائے۔ سورج کے ساتھ، چمکتے ہوئے، سورج کے ساتھ آپ کی کچھ مشابہتیں بھی ہیں اور کچھ فرق بھی ہیں۔ مشابہت کیا ہے؟ سورج کے ساتھ ملتی جلتی بات کیا ہے؟ پہلی بات یہ ہے کہ سب انبیاء ہمارے نزدیک قابل احترام ہیں، سب آسمانِ نبوت کے ستارے اور چاند ہیں مگر آپ سورج یعنی سب سے ممتاز، سب سے اعلیٰ اور اوپر والا درجہ رکھنے والے سید المرسلین ہیں، سید الانبیاء ہیں، امام الانبیاء ہیں۔

اور صرف انبیاء نہیں بلکہ ساری مخلوق کے ہیڈ اور ساری مخلوق کے سردار ہیں۔ آپ نے فرمایا:

« أَنَا سَيِّدُ وَلِدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ » (سنن ابن ماجه: 4308)

میں فخر نہیں کرتا لیکن ایک حقیقت بتاتا ہوں، حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ اللہ نے مجھے سارے بنی آدم کا، آدم کی ساری اولاد کا سردار بنایا ہے۔ پھر بتایا، پھر فرمایا کہ

« وبِيَدِي لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » (سنن ابن ماجه: 4308)

قیامت کے دن مخلوق کی قیادت کا جھنڈا، جس کو آپ نے لواء الحمد کہا ہے مخلوق کی قیادت کا وہ جھنڈا کم ہے اور اللہ کی تعریف کا جھنڈا زیادہ ہے۔ بہر حال اللہ کی تعریف کا جھنڈا یا مخلوق کی قیادت کا جھنڈا کس کے ہاتھ میں ہو گا؟ نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ میں ہو گا۔ انبیاء کی امامت بیت المقدس میں آپ سے کروا کر اس بات پر ایک دفعہ پھر مہر لگا دی کہ آپ ہی امام الانبیاء ہیں اور آپ ہی سید الانبیاء ہیں، پھر قیامت کے میدان میں صرف جھنڈا نہیں بلکہ سب سے بلند اور سب سے اونچا اور سب سے بہتر مقام جہاں آپ کو کھڑا کیا جائے گا یا جہاں آپ تشریف رکھیں گے، وہ کیا ہے؟ وہی ہے جسے مقام محمود کہتے ہیں:

﴿عَسَىٰ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾ (سورة الإسراء: 79)

اس کی خوشخبری سورۂ بنی اسرائیل میں آپ کو دے دی گئی کہ عنقریب ان شاءاللہ آپ کو اس مقام محمود پہ کھڑا کرے گا۔

دوسری مشابہت یہ ہے کہ جس طرح سورج کے، آفتاب کے آنے کے بعد چاند تاروں کی ضرورت نہیں رہتی۔ آفتاب آ جائے، سورج آ جائے تو چاند

تارے خود ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ وہ کریں گے کیا؟ روشنی تو سورج سے ہو گی۔ وہ آگے کیا کریں گے؟ تو جس طرح آفتاب کے آنے کے بعد چاند تاروں کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اسی طرح آپ کے آنے کے بعد پہلے انبیاء کی نبوت ختم ہو گئی۔ آخری نبی آ گئے۔ آپ کی نبوت سب انبیاء کی نبوت پر چھا گئی۔ وہ ماند پڑ گئی، وہ ایک وقت کے لیے تھی۔ آپ کی نبوت ایک وقت کے لیے نہیں ہے۔ اس نے پہلی نبوتوں کو بھی ختم کیا اور آئندہ بھی ہمیشہ چلے گی۔ پہلی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، ختم ہو گئیں۔ اب آپ کی شریعت ہے، جو قیامت تک چلے گی۔ اسی پر عمل کرنا ہو گا۔ اس حقیقت کا اظہار آپ ﷺ نے فرما دیا، ایک اور حدیث میں قسم کھا کے کہا:

« لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوسَى فَاتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي، لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ، وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي، لَاتَّبَعَنِي » (سنن دارمی:449)

اس ذات عالی کی قسم، جس کے قبضے میں میری جان ہے! اگر آج اللہ کے جلیل القدر نبی، موسیٰ علیہ السلام اگر وہ آج آ جائیں، جن کے ذکر سے قرآن کریم کے صفحات بھرے ہوئے ہیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی نبوت کے پیچھے لگ جاؤ۔ تو کیا ہو گا؟ فرمان ہے:

«لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ» (سنن دارمی:449)

تم سیدھی راہ کو کھو دو گے، تم سیدھی راہ سے گمراہ ہو جاؤ گے۔ ہدایت کی بجائے گمراہی میں جا پڑو گے۔

آگے فرمایا:

«وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي، لَاتَّبَعَنِي» (سنن دارمی:449)

اگر وہ زندہ ہوتے، آج کے میرے دور میں ہوتے، تو انہیں بھی میری اتباع کرنی پڑتی۔ انہیں بھی میری نبوت کو تسلیم کرنا پڑتا۔ یہ مقام ہے، سراج منیر کی نبوت کا کہ آپ کے آنے کے بعد اب کسی نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ جو دعویٰ کرے گا، جو آئے گا، جو کہے گا، وہ جھوٹا اور کذاب ہو گا۔ خواہ وہ مسیلمہ ہو، خواہ وہ غلام احمد قادیانی ہو، خواہ کوئی اور ہو۔

آپ کی نبوت کی تیسری مشابہت، آفتاب یعنی سورج سے کیا ہے؟ جس طرح ایک سورج سارے عالم کے لیے کافی ہے، ساری دنیا کے لیے کافی ہے، اسی طرح آپ کی نبوت بھی عالمگیر ہے، ساری دنیا کے لیے کافی ہے، سارے جہان کے لیے عالمگیر نبوت ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (سورة الأعراف: 158)

لوگو! سنو، میں تم سب کی طرف رسول بنا کے بھیجا گیا۔ آپ رحمت للعالمین ہیں۔ کسی ایک قوم کے لیے رحمت نہیں۔ آپ کی رحمت، آپ کی نبوت عالمین کے لیے ہے، تمام جہانوں کے لیے ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ (سورة سبا: 28)

ہم نے آپ کو سب لوگوں کے لیے بشیر و نذیر نبی بنا کے بھیجا ہے۔ پوری انسانی برادری میں سے کوئی آپ کی نبوت سے باہر نہیں ہے۔ جو باہر نکلے گا، وہ اپنا نقصان خود کرے گا۔

چوتھی بات:

سورج کی روشنی اصلی ہوتی ہے۔ چاند کو وہ روشنی دیتا ہے، اس کے ذریعے اللہ چاند کو روشنی دیتا ہے۔ ستاروں کو بھی اتنی روشنی نہیں ملتی۔ آفتاب کی روشنی اصلی ہے۔ ستاروں وغیرہ کو آفتاب کی روشنی منتقل ہوتی ہے۔ مستقل بھی اللہ نے بنائے ہوں گے ستارے، لیکن بہت سے ستاروں کو یہی کہتے ہیں کہ یہ آفتاب کی روشنی منتقل ہوئی۔ آپ کی لائی ہوئی روشنی میں ہزاروں امام، ہزاروں فقیہ، ہزاروں محدث، ہزاروں صحابی پیدا ہوئے۔ آپ کی روشنی آپ تک محدود نہیں رہی۔ اس نے لاکھوں نہیں، کروڑوں نہیں، اربوں انسانوں کے دلوں کو آج تک منور کیا ہے۔ یہ ہیں آپ، آفتابِ نبوت۔

پانچویں بات: آنکھ والا، دیکھنے والا، بینا شخص آنکھیں کھولے تو آفتاب کی روشنی سے، سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اگر کوئی ضد اور تعصب میں آ کر آنکھیں بند کر لے تو اپنا نقصان کرے گا کسی اور کا نہیں کرے گا۔

سعدی نے کہا تھا: اگر کوئی چمگادڑ جیسی آنکھ والا، جو رات کو کھلتی ہے اور دن کو سورج کی روشنی میں بند ہو جاتی ہے، تو اگر چمگادڑ جیسی آنکھوں والا کوئی سورج کی روشنی نہ دیکھ سکے تو اس میں سورج کا کوئی قصور نہیں۔ گناہ اس کا اپنا ہے، جو آنکھیں نہیں کھول رہا۔ یہ تو کچھ مشابہت کی باتیں تھیں، لیکن آپ کی نبوت کی روشنی کا سورج سے فرق بھی ہے۔

پہلا فرق تو یہ ہے کہ سورج ایک وقت میں پوری دنیا کو روشن نہیں کرتا، آدھی دنیا کو روشن کرتا ہے، باقی کی باری بعد میں آتی ہے، لیکن آپ کی روشنی ایک ہی وقت میں ساری دنیا کو منور کیے ہوئے ہے۔ ساری دنیا میں آپ کی ہدایت پھیلی ہوئی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ سورج کی روشنی جتنی بھی ہو، بالآخر رات اس پر چھا جاتی ہے۔ کچھ وقت کے لیے وہ روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ روشنی وہ روشنی ہے، جس پر رات نہیں آتی۔ آپ نے فرمایا بھی ہے کہ جو دین، جو راستہ، جو ہدایت میں لے کر آیا ہوں، یہ وہ راستہ ہے کہ

«لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا.» (سنن ابن ماجه:43)

جس کی رات بھی اس کے دن جیسی ہے، یعنی رات بھی روشن ہے۔ میرے دین کی رات بھی دن جیسی ہے، یعنی اس میں تاریکی ہے ہی نہیں۔ روشنی ہی

روشنی ہے۔ مختصر یہ کہ سورج حرارت دیتا ہے، روشنی دیتا ہے، زندگی دیتا ہے۔ مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے۔ بارش کی طرح، بارش اپنے طور پر زندہ کرتی ہے، سورج اپنے طور پر زندہ کرتا ہے۔ خالی بارش ہو تو ہماری فصلیں اور پھل پک نہیں سکتے۔ بارش کے بعد سورج کی روشنی انہیں پکاتی ہے۔ تو جو حرارت، جو روشنی، جو زندگی آپ لے کر آئے، اس کی تھوڑی سی تفصیل اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلی بات یہ کہ آپ کی لائی ہوئی روشنی، سراج منیر کی لائی ہوئی روشنی ہے۔ اس روشنی نے بت پرستی کو مٹایا، شرک کی جڑوں کو ہلا دیا۔ عرب میں شرک کا سلسلہ ختم کر کے رکھ دیا۔ وہ عرب جن کی زندگی شرک سے عبارت تھی، جو توحید سے میلوں اور کوسوں دور تھے، ان کو آپ نے توحید کا رسیا بنایا، توحید سکھائی۔ یہ وہ لوگ تھے، جو اپنے ہاتھوں سے مٹی اور پتھر کے خدا، مصنوعی خدا، جھوٹے خدا بناتے تھے اور ان کے سامنے سجدے کرتے تھے، ان کی عبادت کرتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو سفر پر نکلتے تو کہتے کہ ریگستان کا سفر ہے، وہاں کوئی پتھر ملے یا نہ ملے، گھر سے پتھر لے کے نکلتے۔ تین پتھر کم از کم ساتھ رکھتے۔ وہی پتھر سفر میں کھانا پکانے کے کام آتے، چولہا بنانے کے کام آتے۔ انہی پتھروں میں سے جو اچھا لگتا، اس کو سامنے رکھ کر سجدہ کرتے۔ آج ہم یہ واقعات سنتے اور پڑھتے ہیں تو ہنستے ہیں یا کم از کم مسکراتے ہیں کہ کیسے بے عقل لوگ تھے؟ بے عقل نہیں تھے، ان میں بڑے بڑے فاضل، قوم کے راہنما اور بڑے بڑے دانشور موجود تھے۔ جیسے حالی نے کہا کہ

قبیلے قبیلے کا ہر اک بت جدا تھا
کسی کا ہُبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزیٰ پہ وہ نائلہ پہ فدا تھا
اسی طرح گھر گھر بنا اک خدا تھا

حفیظ جالندھری نے کہا:

زمیں پر خاک، پتھر اور شجر معبود تھے ان کے
فلک پر انجم و شمس و قمر معبود تھے ان کے

یعنی زمین پر خاک سے بنائے ہوئے بت، پتھر، درخت اور آسمان پر چاند، سورج، ستارے ان کے معبود تھے۔ انہی لوگوں میں پھر آپ نے کیسے لوگ پیدا کیے۔ فرمایا:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ﴾ (سورة النور: 37)

جو توحید پر ثابت قدم رہے، جن کو دنیا داری، تجارتیں، کاروبار اللہ کی یاد سے روک نہیں سکتے تھے۔ بلال ؓ نے کیا کچھ قربان نہیں کیا توحید کے لیے وہ ماریں کھاتے، پتھروں کی سِل سینے پر رکھواتے اور گلیوں میں گھسیٹے جانے کے باوجود "أحد، أحد" پکارتے رہے۔ یہ جذبہ سراج منیر نے ان کے اندر پیدا کیا تھا۔

خبّاب ؓ کو جلتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا، یہاں تک کہ ان کے جسم کی چربی نے آگ کو بجھا دیا، مگر توحید کو پھر بھی نہیں چھوڑا۔ وہ صحابی جو روم میں گرفتار ہوئے، بادشاہ نے کہا: "محمد کا دین چھوڑ دو، توحید چھوڑ دو، سلطنت میں حصہ دوں گا، بیٹی کا رشتہ دوں گا۔ جب نہ مانے تو سامنے ایک قیدی کو گرم پانی کی دیگ میں ڈال کر ایک قیدی کو بھون دیا۔ کہا:

”تمہارا بھی یہی حشر کروں گا، ورنہ محمد (ﷺ) کا دین چھوڑ دو!“

مگر وہ توحید کے رسیا ہو چکے تھے، انہیں دنیا کا لالچ نہ ہلا سکا۔ یہ سب انہی لوگوں میں سے پیدا ہوئے جو شرک میں ڈوبے ہوئے تھے۔

دوسرا فرق جو آپ کی تعلیم نے پیدا کیا: آپ کی روشنی نے لوٹ مار کے عادی لوگوں کو ایماندار بنا دیا۔ جو سود خور تھے، جوا باز تھے، انہی لوگوں میں پھر اللہ کی راہ میں دینے والے، اللہ کی راہ میں سب کچھ لوٹانے والے پیدا ہوئے، جو مال کھینچنے کے عادی تھے، دینے کے عادی نہیں تھے۔ ہر ذریعے سے، ہر جائز ناجائز طریقے سے مال بنانے والے، کھلے دل سے مال دینے والے بنے۔ یہ ہے سراج منیر کا کمال۔ حضرت عمر ؓ نے سنا، آیت کریمہ سنی، ہم بھی سنتے ہیں، ہم بھی پڑھتے ہیں۔ چوتھے پارے کی پہلی آیت:

﴿لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ (سورة آل عمران: 92)

تم نیکی کے اعلیٰ درجے کو اس وقت پہنچو گے جب اپنے سب سے پسندیدہ مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔ فوراً سوچا میرا سب سے پسندیدہ مال کون سا ہے؟ سب سے قیمتی مال تو وہ ہے جو ارض خیبر میں ہے۔ خیبر کی زمین میں سے جو حصہ ملا تھا، ذہن میں آیا کہ وہ سب سے قیمتی ہے۔ یہ سوچ کر اسے وقف کر دیا، اللہ کی راہ میں دے دیا۔

ابو طلحہ ؓ اپنے قیمتی باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ گھنا باغ، ایک پرندہ آیا، بعض درخت اس کے اتنے گھنے تھے کہ اسے باہر نکلنے کا راستہ نظر نہیں آتا تھا، کبھی ادھر جاتا ہے، کبھی ادھر جاتا ہے۔ نفل نماز میں ابو طلحہ کی توجہ پرندے کے ادھر ادھر اڑنے سے پرندے کی طرف ہو گئی۔ بعد میں اتنی سی بات پہ اتنی پشیمانی ہوئی کہ ایک پرندے کی نقل و حرکت نے مجھے اللہ کی یاد سے غافل کر دیا، میری نماز خراب کر دی، نماز پہ توجہ خراب کر دی۔ اس کا علاج کیا ہے؟ خود ہی اس کا علاج یہ سوچا کہ یہ قیمتی باغ اللہ کی راہ میں دے دیتا ہوں تاکہ آئندہ ایسا کوئی واقعہ نہ ہو۔ یہ جذبہ کہاں سے آیا؟ آپ کی تعلیم سے آپ کی لائی ہوئی روشنی سے، یہ سراج منیر کا کمال تھا، کسی اور کا کمال

نہیں تھا۔ اللہ کی توفیق تھی، لیکن آپ اس کا ذریعہ بن گئے۔

تیسری بات، لڑتے رہنے والے لوگ، بات بات پہ تلوار نکالنے والے، جن میں قبیلوں کی جنگ شروع ہوتی تھی تو ہفتوں نہیں، مہینوں نہیں، سالوں تک چلتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہوتے تھے۔

حالی مرحوم نے کہا کہ

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

جانور چرانے پہ، جھگڑا کہ تمہارا جانور میری چراگاہ میں کیوں آیا؟ میری جگہ پہ کیوں آیا؟ کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا، تمہارا گھوڑا میرے گھوڑے سے آگے کیوں بڑھ گیا؟

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

یہ جھگڑے ہوتے تھے۔ اور آپ ﷺ نے آ کے کیا کیا؟ سراج منیر کا کمال کیا تھا؟

﴿ مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ﴾ (سورة الأنفال: 63)

آپ نے دلوں کو جوڑ دیا، لڑنے والوں کے دلوں کو جوڑ دیا، تکرار اور جھگڑا اور لڑائی کرنے والوں کے دل آپس میں ملا دیئے۔ اسی سے متاثر ہو کر ایک ہندو شاعر نے کہا تھا:

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

قطرے قطرے کو ملا کے دریا بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ذرے ذرے کو ملا کے ایک وسیع صحرا اور ریگستان بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن آپ نے یہ کر دکھایا، اللہ کی توفیق سے کر کے دکھایا۔ مواخاتِ مدینہ اس کا واضح ثبوت ہے۔

مدینے میں آ کے جس طرح آپ نے انصار اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنایا، ایک ایک کو پکڑا اور اسے دوسرے کا بھائی بنا دیا، یہ تمہارا بھائی ہے اے مہاجر! یہ انصاری تمہارا بھائی ہے، اے انصاری! یہ مہاجر تمہارا بھائی ہے۔ اور پھر انہوں نے واقعتاً بھائی بن کے دکھایا۔ اپنے گھروں میں، اپنے کاروبار میں، اپنے مال میں، اپنی تجارت میں، اپنے باغوں میں، اپنی کھجوروں میں جو بھی چیز تھی، اس میں انہیں باقاعدہ شامل کیا، باقاعدہ حصہ دار بنایا۔ وہ واقعہ بھی مشہور ہے۔

عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے انصاری بھائی نے کہا:

میرا سارا مال آدھا میرا، آدھا آپ کا، حتی کہ دو بیویاں ہیں، ان میں سے جس کو چاہو، میں طلاق دے دیتا ہوں، آپ اس سے شادی کر لیں۔ انہوں نے کہا: میں تاجر آدمی ہوں، مجھے بازار کا راستہ دکھا دو، بازار میں انٹروڈیوس کرا دو، باقی میں جانوں اور میرا اللہ جانے۔ (صحیح بخاری:3937)

لیکن اس نے کوئی کمی نہیں کی اپنی طرف سے۔ اتنا ان کو قریب کیا آپس میں کہ حالی نے کہا ہے:

وہ دیں جس نے اعدا کو اخواں بنایا
وحوش اور بہائم کو انساں بنایا
درندوں کو غمخوارِ دوراں بنایا
گڈریوں کو عالم کا سلطان بنایا

یہ کارکردگی ہے، یہ کارنامہ ہے سراج منیر، ﷺ کا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ چھوٹی اور پست باتوں کے لئے، ذاتی اغراض اور ذاتی انتقام کے لئے لڑنے والے سب کچھ بھول گئے۔ لڑتے تھے تو صرف اللہ کے دین کے لئے لڑتے تھے۔ ذاتی چیزوں کے لئے نہیں لڑتے تھے اور یہ انقلاب آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مثال موجود ہے۔ میدان جنگ میں دشمن کو زیر کیا۔ اس کے سینے پہ سوار ہوئے۔ خنجر سے اس کا کام تمام کرنے والے تھے کہ اس نے منہ پر تھوکا۔ فوراً اسے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ وہ حیران کہ تم مجھ پر قابو پا چکے تھے، آسانی سے ختم کر سکتے تھے پھر مجھے چھوڑ کیوں دیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تمہیں اللہ کے دین کے لئے میں مارنے والا تھا، جب تم نے میرے منہ پر تھوکا تو ایک ذاتی انتقام والی بات بن گئی۔ اس لیے چھوڑ دیا، یہ اخلاص اور یہ للّٰہیت ان لوگوں میں پیدا کیا، جو پست اور چھوٹی اغراض کے لئے تکرار کرنے والے تھے۔ پھر یہ قوم بالعموم بے صبر تھی، صبر سے خالی تھی، انہیں صابر بنایا، انہیں اللہ کی رضا کے لیے اور دین کے لیے تکلیف، مشقت کاٹنے والا اور برداشت کرنے والا بنایا۔

اس کی ایک مثال خنساء رضی اللہ عنہا ہیں، صحابیہ، جو شاعرہ تھیں، جو زمانہ جاہلیت میں اتنی بے تاب، اتنی بے صبر کہ بھائی فوت ہوا تو اس کی موت میں آنسو اور رونا ان کا تھمتا نہیں تھا۔ بھائی سے محبت میں اشعار کہے، اپنے رونے کو جسٹیفائی کیا۔

" أَعْيْنِي جُودًا وَلَا تَبْخَلَا . " (سیرة ابن اسحاق: 67/1)

سخاوت والے بھائی کے بارے میں میری آنکھو! بہتے جانا ہے، میرے بھائی کی یاد میں۔ یہ کیفیت تھی اسلام سے پہلے، لیکن اسلام لانے کے بعد پھر کیا ہوا۔ پھر صبر کیسا آیا؟ ہمت کیسے آئی دل میں؟ سراج منیر کی تعلیم و تربیت سے کہ جنگ میں اپنے چار شیر جوان بیٹوں کو اتارا اور انہیں نصیحت کی، انہیں کہا کہ بیٹو: یاد رکھنا۔ اس فانی دنیا سے آخرت کا باقی رہنے والا، ہمیشہ رہنے والا گھر بہت اچھا ہے۔ وہ مل جائے تو اس کی کوشش کریں۔ وہ کیسے ملے گا؟ شہادت سے ملے گا اور واقعی چاروں کے چاروں شہید ہو گئے، لیکن ایک ایسی خاتون جس نے بھائی کی میت پہ جس طرح آنسو بہائے، بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی سالوں تک بہاتی رہی، اُس طرح آنسو بہانے کی بجائے کیا کہا؟ شکر ہے اللہ کا کہ اس نے مجھے چار شہیدوں کی ماں بنایا

ہے۔

یہ فرق ہے کفر اور اسلام کے دور کا اور یہ ایک عجیب بات ہے، عجیب واقعہ ہے۔ جس طرح وہ بھائی کی میت پہ آنسو بہاتی تھی، بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی سالوں تک بہاتی رہی، اس طرح آنسو بہانے کے بجائے اب کہا: شکر ہے اللہ کا کہ اس نے چار بیٹوں کی، چار شہیدوں کی ماں مجھے بنایا ہے۔ یہ فرق کفر اور اسلام کا، جاہلیت کے دور اور اسلام کے دور کا ہے۔

عمرو بن عاص کے بھائی ہشام بن عاص ؓ، یہ رومیوں کے ساتھ ایک جنگ میں شہید ہوئے اور ان کی لاش ایک تنگ درے میں پڑی تھی۔ درہ پہاڑوں کے درمیان گھاٹی کو کہتے ہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ رومیوں کا تعاقب کرنا تھا، بھاگے ہوئے رومیوں کے پیچھے جانا تھا، لیکن اس کے لئے مسلمان سپاہیوں کو اس لاش کے اوپر سے گزرنا پڑتا تھا۔ سب ہچکچاتے تھے، اپنے شہید بھائی کی لاش کو روندتے ہوئے کیسے گزریں اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ تنگ راستے پہ لاش پڑی تھی۔ اس کے اوپر سے چلتے ہوئے جانا تھا۔ سب وہاں رک گئے، ان کو ہمت کس نے دلائی۔ سگے بھائی نے ، عمرو بن عاص ؓ نے۔ انہوں نے کہا:

"أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ اللَّهَ قَدِ اسْتَشْهَدَهُ وَرَفَعَ رُوحَهُ، وَإِنَّمَا هِيَ جُثَّةٌ، فَأَوْطِئُوهُ الْخَيْلَ، ثُمَّ أَوْطَأَهُ هُوَ، ثُمَّ تَبِعَهُ النَّاسُ حَتَّى قَطَّعُوهُ۔ " (الاستیعاب: 4/154)

لوگو! اللہ نے اس کی روح اٹھالی ہے، یہ جسم ہے، بے جان جسم ہے، جہاد کے لئے اسے روندنا پڑتا ہے، میری طرف سے اجازت ہے۔ یہ ہے صبر کی انتہا، جو آپ نے ان میں پیدا کی۔

پھر اگلی بات اخلاقی عیوب بھی اس قوم میں بے شمار تھے، حالی نے کہا کہ

جُوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی
شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی
غرض ہر طرح ان کی حالت بُری تھی

اخلاقی طور پر۔ کیا حال تھا؟ بدکاری کرتے تھے۔ اس پہ فخر یہ اشعار لکھتے تھے۔ عورت کے نام کے ساتھ اسے نشر کرتے تھے۔ فلاں سے میں نے یہ کیا۔ علی الاعلان شعروں میں اس کو بیان کرتے تھے اور قوم اسے انجوائے کرتی تھی۔ انہی میں آپ نے مرثد ابن ابی مرثد جیسے پیدا کیے۔ اس کا واقعہ میں پہلے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔

مرثد ابن ابی مرثد ڈاکو تھے، نقب زن تھے اور اس لیے اسلام لانے سے گھبراتے تھے کہ اسلام میں چوری ڈاکہ منع ہے۔ مجھے اور کوئی کام نہیں آتا میں کیا کروں گا؟ کیا کھاؤں گا؟ بال بچے کو کیا کھلاؤں گا؟ آپ سے مشورہ کرتے اپنا مسئلہ آپ کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے کہا، جو کام آتا ہے وہی کرتے رہو۔ سننے والے حیران ہوئے کہ اس کو خاص اجازت دی جا رہی ہے، نقب زنی کی، ڈاکے کی، یہ کیا بات ہے؟ کیا وجہ ہے؟ آپ نے ایکسپلین کیا، کیا وجہ بتائی۔ آپ نے فرمایا۔ نقب زنی کرتے ہو نا دیواریں توڑتے ہو، چھت توڑتے ہو، لوگوں کا مال چراتے ہو۔ اب تم نے نقب زنی کرنی ہے۔ اپنے ان بھائیوں کو چھڑانے کے لیے، جو مکے میں قید ہیں، صرف اس جرم میں کہ وہ مسلمان کیوں ہوئے؟ ہم تمہارا خرچ ہم اٹھائیں گے۔ ریاست اٹھائے گی، سٹیٹ اٹھائے گی، میں اٹھاؤں گا۔ تم یہ کام کرو۔ کرنا شروع کیا، کئی لوگوں کو آزاد کیا۔ اسی مہم میں جا رہے تھے۔

ایک پرانی یار، بدکار پرانی دوست عورت نے بلایا، اس زمانے میں ساری خرابیوں کے باوجود یہ تھا کہ ایسی عورتوں کو شہر سے باہر نکالتے تھے، شہر کے اندر گندمت ڈالو۔ شہر کے باہر اس کا مکان تھا۔ اس نے چاند کی روشنی میں دیکھا کہ یہ تو مرثد ہے۔ پرانا ساتھی ہے۔ آواز دی آؤ۔ اس نے کہا نہیں آتا۔ اس نے کہا کیا ہوا؟ کس نے روکا ہے؟ خوبصورت جملہ کہا۔

" إِنَّ الْإِسْلَامَ قَدْ حَالَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ" (زاد المسیر: 187/1)

میرے اور تیرے درمیان ایک دیوار آ گئی ہے، روک اور آڑ آ گئی ہے، جس کا نام ہے اسلام، اب میں نہیں آ سکتا۔ یہ انہی بدکاروں میں تھے جو بدکاری پہ فخر کرتے تھے۔ انہی میں ایسے لوگ پیدا کیے۔

ساتویں بات یہ لوگ حرام خور بھی تھے۔ ڈاکہ چوری، زیادتی وہ تو اپنی جگہ لیکن ان کی عادت تھی کہ مردار کو بھی نہیں چھوڑنا۔ انسانی خون کو بھی نہیں چھوڑنا، جانور کے خون کو بھی نہیں چھوڑنا۔ ان حالات میں (ابو امامہ باہمی، صدی بن عجلان) مسلمان ہوئے۔ تو ساتھ ہی شعور پیدا ہوا کہ اسلام کی روشنی میری قوم تک بھی پہنچے۔ ان کو مان تھا کہ میں قوم میں بڑا باعزت ہوں اور قوم میری بڑی قدر کرتی ہے۔

اس لیے میری بات بھی سنے گی لیکن جب اسلام کی دعوت دی۔ تو جواباً انہوں نے ایذا دی، انہوں نے مانا بھی نہیں اور ایذا دی۔ ایک جگہ بھوکا پیاسا ڈال دیا، اور دو تین دن کی بھوک کے بعد جان بوجھ کر جانور کے پیالہ لے کر آئے کہ یہ پی لو، بھوکے ہو پیاسے ہو تو یہ پی لو۔ انہوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ میرے دین نے اضطرار کے وقت جب آدمی مرنے تک پہنچ جائے مجبور ہو، موت اور زندگی کا سوال پیدا ہو جائے تو میرے دین نے مردار اور حرام کھانے کی اجازت دی ہے، لیکن میں اسے پی کے تمہارے دلوں کو خوش نہیں کروں گا۔ میں نہیں پیوں گا۔

اس لیے کہ تم میری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔ وہ چلے گئے ناکام ہو کے چلے گئے۔ یہ سو

گئے تو خواب میں ان کو کسی نے ایک مشروب پلایا، ایسا پانی پلایا کہ پھر زندگی بھر پیاس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ یہ وہ انقلاب ہے جو سید العالمین سراج منیر ﷺ لے کر آئے اور زبردستی نہیں عفو وکرم کی تلوار سے آپ نے لوگوں کو گھائل کیا اور اپنا مطیع اور تابع فرمان بنایا۔

وہی عمر رضی اللہ عنہ جو تلوار لے کر نکلے تھے کہ نعوذ باللہ محمد کو ختم کرتا ہوں، شہید کرتا ہوں، تاکہ یہ کفر واسلام کے اختلاف کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔ ایک دن ان پر وہ بھی آیا تھا پھر نبی کریم ﷺ کی وفات کا دن آیا، دنیا سے جانے کا دن، جب انہی عمر نے پھر تلوار نکالی اور کہتے یہ تھے کہ

جس کی زبان سے میں نے سنا کہ محمد فوت ہوئے، میں اس کو فوت کر دوں گا میں یہ لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اتنا انقلاب کہ نفرت کرنے والوں میں اتنی محبت پیدا کرنا، اپنے اخلاق سے، اپنے کردار سے، اپنے لطف وکرم سے، اپنی مہربانی سے، اس کی کہیں مثال نہیں ہے۔

عمرو بن سہیل یہ وہ بندہ تھا، جو مذاکرات کار تھا، گفت وشنید کرتا تھا، صلح حدیبیہ کے موقع پہ قریش کا نمائندہ تھا، جس وقت معاہدہ لکھا جا رہا تھا تو دستور کے مطابق دونوں فریقوں کا نام لکھا گیا۔

یہ معاہدہ محمد رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان ہے۔ اس نے کہا، مجھے ان لفظوں پہ اعتراض ہے۔ یہ رسول اللہ کا لفظ ہم نہیں مانتے۔ مانتے ہوتے تو ہمارے درمیان جنگیں کیوں ہوتیں؟ آج کی صلح کی نوبت کیوں آتی؟ میں آپ کو رسول مانتا ہی نہیں، یہ الفاظ میں نہیں لکھنے دوں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسری طرف سے لکھنے والے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

علی مٹا دو! ان لفظوں کو۔ میں رسول ہوں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے۔ میں تو رسول ہوں۔ کاٹ دو۔ ہم صلح کرنا چاہتے ہیں۔ کاٹ دو ان الفاظ کو۔ علی (رضی اللہ عنہ) جو انتہائی فرمانبردار تھے، انہوں نے کہا، اللہ کے رسول! آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پہ، لیکن لفظ میں اپنے ہاتھوں سے نہیں کاٹ سکتا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

اچھا اتنی نشاندہی کر دو کہ یہ لفظ کہاں ہے؟ میں اپنے ہاتھ سے مٹا دیتا ہوں۔ صلح جو کرنی ہوئی۔ تو یہ عمرو بن سہیل جو اتنا ضدی تھا کہ رسول اللہ کے لفظ نہیں لکھنے دیتا تھا، یہی وہ تھا کہ آپ کی وفات کے دن مسلمانوں کی وہ ہمت اور تسلی دلانے کے لیے ایک نمبر کا خطیب تھا۔ اس نے ایک شاندار خطبہ دیا، صبر کی تلقین کی، آپ کے چلے جانے کے باوجود دین پر قائم رہنے کی نصیحت کی اور اس طرح کی باتیں اس نے بڑے اچھے طریقے سے کہیں۔ یعنی یہ فرق ہے کہ ایک وہ تھا کہ محمد رسول اللہ لکھنے پہ اعتراض تھا اور آج ان کے دین کا دفاع کر رہا تھا۔ ابو سفیان جو بدر کے بعد تمام جنگیں آرگنائز کرنے والا، برپا کرنے والا، ان کی فنڈنگ کرنے والا اور ان کے لیے بندے اکٹھے کرنے والا تھا۔ اس کی حالت بھی بدلی۔ حنین کے دن کیا تھا؟

«وَأَبُو سُفْيَانَ آخِذٌ بِرِكَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ».

(صحیح مسلم :1775)

رسول اللہ ﷺ کی سواری کی رکاب پکڑ کے غلاموں کی طرح آپ کے آگے چل رہا تھا۔ اتنی محبت اس کے دل میں بھر گئی تھی اور اس کی بیوی ہند جس نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید بھی کرایا تھا، اس نے کہا کہ مسلمان ہونے سے پہلے آپ کا خیمہ دنیا بھر کے خیموں اور گھروں سے سب سے زیادہ مجھے برا لگتا تھا، یعنی آپ کی ذات مراد ہے اور اب مسلمان ہونے کے بعد آپ کا خیمہ زمین بھر میں، پوری دنیا میں سب سے محبوب خیمہ اور سب سے محبوب ذات اب آپ کی ذات ہے۔

وحشی جس نے ہند کے کہنے پہ یہ ساری حرکت کی تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، اسے معافی تو آپ نے دے دی تھی رحمت اللعالمین نے، لیکن اس کی اپنی تسلی اس دن ہوئی، جب اس نے مسیلمہ کذاب جیسے جھوٹے نبی کو اسی طرح قتل کیا جس طرح اس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ کہاں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والا اور کہاں مسیلمہ کو کیفر کردار تک پہنچانے والا، ان سب لوگوں کو تو آپ نے دینی اور دنیاوی بلندی عطا کی۔ ان گرے پڑے ڈاؤن لوگوں کو بلندیاں عطا کیں۔ ذروں کو ہمدوش ثریا بنایا۔ خدائے واحد کا نام اور اس کے دین کو آپ نے بلند کیا۔ مکمل انقلاب لائے، گویا کہ زمین و آسمان کو بدل دیا۔ یہ ہے سراج منیر اور یہ ہے سراج منیر کے کارنامے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

☆☆☆

امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا:
”گھٹیا آدمی کون ہے؟“ فرمایا: ”جو مہمان کے سامنے مہنگائی کا رونا روتا ہے۔“
(المجالسۃ وجواہر العلم للدینوری:300)

ابو العیناء رحمہ اللہ (283ھ) کہتے ہیں:
”مدینہ سے ایک دیہاتی میرے ہاں مہمان ہوا۔ جب ہم کھانے کیلیے بیٹھے تو میں نے رواں سال کی مہنگائی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس دیہاتی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا: ”مہمان کے سامنے مہنگائی کا رونا رونا خلافِ مروءت ہے۔“ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بسیار کوشش کی کہ کچھ کھالے مگر اس نے انکار کر دیا اور چلتا بنا۔(نثر الدرر فی المحاضرات للآبی:6/41)
کیونکہ اس فعل میں جانے انجانے میں مہمان کو بوجھ ہونے کا احساس دلانا ہے، جو انتہائی نامناسب بات ہے۔ اکرام الضیف ایمان کا عظیم باب ہے۔



مرد کے لیے ریشم پہننے اور نیچے بچھانے کی ممانعت

سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ

أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ رَأَى حُلَّةً سِيَرَاءَ تُبَاعُ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ، فَقَالَ عُمَرُ: يَارَسُولَ اللهِ! لَوِ اشْتَرَيْتَهَا فَلَبِسْتَهَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلِلْوَفْدِ إِذَا قَدِمُوا عَلَيْكَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّمَا يَلْبَسُ هَذِهِ مَنْ لَا خَلَاقَ لَهُ فِي الْآخِرَةِ». ثُمَّ جَاءَتْ رَسُولَ اللهِ ﷺ مِنْهَا حُلَلٌ، فَأَعْطَى مِنْهَا عُمَرَ حُلَّةً، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! كَسَوْتَنِيهَا وَقَدْ قُلْتَ فِيهَا مَا قُلْتَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنِّي لَمْ أَكْسُكَهَا لِتَلْبَسَهَا، إِنَّمَا كَسَوْتُكَهَا لِتَبِيعَهَا أَوْ لِتَكْسُوهَا». فَكَسَاهَا عُمَرُ أَخًا لَهُ مِنْ أُمِّهِ مُشْرِكًا بِمَكَّةَ.

(صحيح بخاري، كتاب اللباس، باب الحرير للنساء:5841، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة على الرجال والنساء: 2068)

”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کے دروازے کے پاس ایک دھاری دار عمدہ پوشاک فروخت ہوتی دیکھی تو عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیوں نہ آپ ﷺ اسے خرید لیں اور جمعہ کے دِن اور جس دِن آپ ﷺ کے پاس وفد آئیں اس دِن پہن لیا کریں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے تو وہی پہنے گا جس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس اسی طرح کی کچھ پوشاکیں آئیں تو آپ ﷺ نے ان میں سے ایک پوشاک سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دے دی، تو انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ یہ مجھے پہننے کے لیے دے رہے ہیں حالانکہ آپ تو اس کے متعلق یہ فرما چکے ہیں جو آپ نے فرمایا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں یہ تمہیں اس لیے نہیں دے رہا کہ اسے تُو پہن لے، بلکہ میں تو اس لیے دے رہا ہوں تاکہ تُو اسے فروخت کر دے یا اسے کسی کو پہنا دے۔ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وہ پوشاک اپنے ایک مشرک علاتی بھائی کو پہنا دی، جو مکہ میں رہتا تھا۔“

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

أُهْدِيَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ حُلَّةُ سِيَرَاءَ فَبَعَثَ بِهَا إِلَيَّ فَلَبِسْتُهَا وَخَرَجْتُ فِيهَا، فَنَظَرَ إِلَيَّ فَكَأَنَّهُ كَرِهَهُ، فَقَالَ لِي: «مَا أَعْطَيْتُكَهَا لِتَلْبَسَهَا» فَأَمَرَنِي فَأَطَرْتُهَا بَيْنَ نِسَائِي

(صحيح بخاري، كتاب الهبة، باب هدية ما يكره لبسها: 2614، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة على الرجال والنساء:2071)

”رسول اللہ ﷺ کو ایک دھاری دار عمدہ پوشاک تحفہ دی گئی، آپ ﷺ نے وہ مجھے بھیج دی، میں وہ پہن کر نکلا تو آپ ﷺ نے مجھے یوں دیکھا کہ جیسے آپ نے اسے ناپسند کیا ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے یہ تمہیں اس لیے نہیں دی تھی کہ اسے تُو پہن لے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا تو میں نے اسے اپنی عورتوں میں تقسیم کر دیا۔“

دیگر روایات میں اس کی وضاحت ملتی ہے کہ وہ پوشاک ریشم کی تھی اور ریشم چونکہ مردوں کے لیے جائز نہیں ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار اور اتار دینے کا حکم فرمایا۔

سیدنا شعبہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَبِسَ الْحَرِيرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْآخِرَةِ»

(صحيح بخاري، كتاب اللباس، باب لبس الحرير وافتراشه للرجال، وقدر ما يجوز منه: 5832، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة على الرجال والنساء: 2073)

”جو شخص دنیا میں ریشم پہنے گا وہ اسے آخرت میں نہیں پہن سکے گا۔“

ابنِ ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ

اسْتَقَى حُذَيْفَةُ، فَأَتَاهُ دِهْقَانٌ بِإِنَاءِ فِضَّةٍ فَأَخَذَهُ فَرَمَاهُ بِهِ، وَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَانَا أَنْ نَشْرَبَ فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَأَنْ نَأْكُلَ فِيهَا، وَعَنْ لُبْسِ الْحَرِيرِ وَالدِّيبَاجِ وَأَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ، وَقَالَ: «هُوَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الْآخِرَةِ»

(صحيح بخاري، كتاب اللباس، باب لبس الحرير وافتراشه للرجال، وقدر ما يجوز منه: 5831، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، الباب الأول: 2967)

”سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پانی مانگا تو ایک دہقان چاندی کے برتن میں پانی لے آیا، آپ نے اسے پکڑ کر پھینک دیا اور فرمایا: یقیناً رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سونے اور چاندی کے برتنوں میں پینے، ان میں کھانے اور موٹے وباریک ریشم پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے، اور آپ ﷺ نے کا فرمان ہے کہ یہ (سب

کچھ) ان کے لیے دنیا میں ہے اور تمہارے لیے آخرت میں۔"

"ان کے لیے دنیا میں ہے" سے مراد کافروں اور ان لوگوں کے لیے جو ان کی حرمت کا علم ہونے کے باوجود انہیں استعمال کرتے ہیں، اور ایسے لوگوں کو آخرت میں ان تمام چیزوں سے محروم رکھا جائے گا جبکہ مؤمنین کو وہاں یہ سب بہ طورِ انعام و تکریم پیش کی جائیں گی۔

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:

«الْحَرِيرُ وَالذَّهَبُ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي حَرَامٌ، وَحَلَالٌ لِإِنَاثِهِمْ»(السنن الكبرى للبيهقي: 275/3، سلسلة الأحاديث الصحيحة:1865)

"ریشم اور سونا میری اُمت کے مردوں پر حرام ہے اور ان کی عورتوں کے لیے حلال ہے۔"

کڑھائی وغیرہ میں ریشم استعمال کر لینے کی رخصت

سوید بن غفلہ بیان کرتے ہیں کہ

خَطَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ بِالْجَابِيَةِ فَقَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ لُبْسِ الْحَرِيرِ إِلَّا مَوْضِعَ أُصْبُعَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةٍ أَوْ أَرْبَعَةٍ.(صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، الباب الأول: 2069)

"سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جابیہ کے مقام پہ خطبہ دیا اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ریشم پہننے سے منع فرمایا ہے، سوائے دو، تین یا چار انگلیوں کی جگہ کے بہ قدر۔"

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ

إِنَّمَا نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الثَّوْبِ الْمُصْمَتِ مِنَ الْحَرِيرِ، فَأَمَّا الْعَلَمُ مِنَ الْحَرِيرِ وَسَدَى الثَّوْبِ فَلَا بَأْسَ بِهِ.

([صحيح دون قوله فأما العلم...] سنن أبوداؤد، كتاب اللباس، باب الرخصة في العلم وخيط الحرير: 4055، الإرواء: 279)

"نبی ﷺ نے خالص ریشم کا کپڑا پہننے سے منع فرمایا، البتہ ریشم کی کڑھائی اور کپڑے کا تانا ریشمی ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

اس حدیث میں "ریشم کی کڑھائی" کے الفاظ ضعیف ہیں، اس کے علاوہ دونوں حکم صحیح ہیں، یعنی خالص ریشم کی ممانعت اور ریشمی تانے والے کپڑے کی رخصت۔

دورانِ جنگ اور خارش کی صورت میں ریشم پہننے کی رخصت

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَخَّصَ لِعَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ فِي قَمِيصٍ مِنْ حَرِيرٍ فِي سَفَرٍ مِنْ حِكَّةٍ كَانَ يَجِدُهَا بِجِلْدِهِ، وَلِلزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ (صحيح بخارى، كتاب اللباس، باب ما يرخص للرجال من الحرير للحكة: 5839، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب إباحة لبس الحرير للرجل إذا كان به حكة أو نحوها: 2076)

"رسول اللہ ﷺ نے عبد الرحمان بن عوف کو ان کے جسم پر خارش ہو جانے کی وجہ سے ریشم کا قمیض پہننے کی رخصت دی تھی۔"

عطاء کے داماد ابو عمر بیان کرتے ہیں کہ

رَأَيْتُ عِنْدَ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ جُبَّةً مُزَرَّرَةً بِالدِّيبَاجِ، فَقَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَلْبَسُ هَذِهِ فِي الْحَرْبِ(السنن الكبرى للبيهقي:268/3)

"میں نے اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے پاس ایک جُبّہ (چوغہ) دیکھا جس پر موٹے ریشم کے بٹن لگائے گئے تھے، انہوں نے بتلایا کہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے موقع پر اسے پہنا کرتے تھے۔"

یعنی یہ دو اضطراری صورتیں ہیں جنہیں ریشم کے عام حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور دورانِ جنگ یا بہ صورتِ خارش ریشمی لباس پہننے کی رخصت دی گئی ہے۔

مردوں کے لیے زعفرانی اور زرد رنگ کے کپڑے پہننے کی ممانعت

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى أَنْ يَتَزَعْفَرَ الرَّجُلُ

(صحيح بخارى، كتاب اللباس، باب النهي عن التزعفر للرجال: 5846، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب النهي عن التزعفر للرجال:2101)

"نبی ﷺ نے مرد کو زعفرانی رنگ استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔"

سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ

رَآنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ وَعَلَيَّ ثَوْبَانِ مُعَصْفَرَانِ، فَقَالَ: «هَذِهِ ثِيَابُ أَهْلِ النَّارِ، فَلَا تَلْبَسْهَا»(صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب النهي عن لبس الرجل الثوب المعصفر: 2077، مسند أحمد:193/2)

"رسول اللہ ﷺ نے مجھ پر دو زرد رنگ کے کپڑے دیکھے تو فرمایا: یہ جہنمیوں کے کپڑے ہیں، تم یہ مت پہنو۔"

یہ دونوں چونکہ نسوانی رنگ ہیں اور ایسے کپڑے پہننے سے عورتوں کی مشابہت لازم آتی ہے، اس لیے آپ ﷺ نے ان سے منع فرمایا۔

نمود و نمائش والا کپڑا پہننے پر وعید

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنْيَا أَلْبَسَهُ اللهُ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.» وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي زُرْعَةَ، وَزَادَ: «ثُمَّ تَلَهَّبُ فِيهِ النَّارُ.»

(سنن أبوداؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة: 4029، سنن ابن ماجه، كتاب اللباس،

باب من لبس شهرة من الثياب: 3606، صحيح الجامع للألباني: 6526)

”جس نے دنیا میں شہرت کا لباس پہنا اللہ تعالیٰ اسے روزِ قیامت ذِلّت کا لباس پہنائے گا۔ اور عثمان بن ابی زرعہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے: ”پھر اس میں آگ بھڑکے گی۔“

گندے اور میلے کپڑے پہننا ناپسندیدہ عمل

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ أَتَانَا رَسُولُ اللهِ ﷺ زَائِرًا فِي مَنْزِلِنَا، فَرَأَى رَجُلًا شَعِثًا، فَقَالَ: «أَمَا كَانَ هٰذَا يَجِدُ مَا يُسَكِّنُ بِهِ رَأْسَهُ؟» وَرَأَى رَجُلًا عَلَيْهِ ثِيَابٌ وَسِخَةٌ، فَقَالَ: «أَمَا كَانَ هٰذَا يَجِدُ مَا يَغْسِلُ بِهِ ثَوْبَهُ؟»(سنن أبوداؤد، كتاب اللباس، باب في غسل الثوب وفي الخلقان: 4062، سنن نسائي، كتاب الزينة، باب تسكين الشعر: 5236)

”رسول اللہ ﷺ بغرضِ ملاقات ہمارے گھر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے ایک پراگندہ بالوں والے شخص کو دیکھا تو فرمایا: کیا اسے ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے یہ اپنے بال سنوار لے؟ اور آپ ﷺ نے ایک شخص کو میلے کچیلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا: کیا اسے ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس سے یہ اپنے کپڑے دھولے؟“

صاف ستھرا لباس پہننے کی ترغیب

سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:
«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ، وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ إِيمَانٍ». فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ! الرَّجُلُ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنًا؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ مَنْ بَطَرَ الْحَقَّ وَغَمَصَ النَّاسَ» (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب تحريم الكبر وبيانه: 91، سنن ترمذي، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في الكبر: 1999)

”جس شخص کے دِل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا اور جس کے دِل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اور اس کا جوتا اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر ہے)؟ تو رسول اللہ ﷺ فرمایا: یقیناً اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے) اور (خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے، تکبر یہ ہے کہ آدمی حق کو ٹھکرائے اور لوگوں کو حقیر جانے۔“

یعنی صاف ستھرا لباس پہننا، عمدہ جوتا پہننا اور نفاست سے رہنا تکبر میں شمار نہیں ہوتا، کیونکہ تکبر سے مراد تو یہ ہے کہ آدمی حق بات کو قبول کرنے سے انکار کرے اور لوگوں کو اپنے سے کم مرتبہ سمجھے اور ان کے ساتھ حقارت آمیز رویہ اپنائے۔

ابو احوص اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:
أَبْصَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَيَّ خُلْقَانًا فَقَالَ: «أَلَكَ مَالٌ؟»، قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: «أَنْعِمْ عَلَى نَفْسِكَ كَمَا أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْكَ»(سنن أبوداؤد، كتاب اللباس، باب في غسل الثوب وفي الخلقان: 4063، سنن نسائي، كتاب الزينة، باب ذكر ما يستحب من لبس الثياب...: 5294)

”نبی ﷺ نے مجھے پرانے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا: کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر انعام فرمایا ہے اسی طرح تو بھی اپنی جان پر انعام کر۔“ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے مال و دولت کی نعمت سے نوازا ہے تو نئے کپڑے خرید کر پہن۔

عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:
«كُلُوا وَاشْرَبُوا وَتَصَدَّقُوا وَالْبَسُوا فِي غَيْرِ مَخِيلَةٍ وَلَا سَرَفٍ، فَإِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ يُحِبُّ أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَى عَبْدِهِ»
(سنن ابن ماجه، كتاب اللباس، باب البس ما شئت ما أخطأك سرف أو مخيلة: 3605)

”کھاؤ، پیو، صدقہ و خیرات کرو اور ایسا لباس پہنو جو بڑائی اور فضول خرچی والا نہ ہو، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ وہ اپنے بندے پر اپنی عطا کی ہوئی نعمت کے اثرات دیکھیں۔“

☆☆☆

تعلیم وتربیت کے مرکز یا ڈگریاں بیچنے والی دکانیں؟

مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈا نگری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ’دینی تعلیم وتربیت کے اصول و آداب‘ میں ایک واقعہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا نذیر احمد رحمانی جو جامعہ رحمانیہ بنارس میں طلبہ کی تعلیم وتربیت پر مامور تھے۔ ان کو خبر ملی کہ ایک طالب علم سینما دیکھنے کا عادی ہے۔ ایک رات وہ مدرسے کے ہاسٹل سے غائب رہا اور تحقیق کرنے پر ثابت ہوا کہ وہ سینما دیکھنے گیا تھا۔ مولانا رحمانی نے اس لڑکے کو مدرسے سے نکال دیا۔ محلے کے لوگوں نے سفارش کی کہ یہ لڑکا آٹھویں جماعت کا ہے۔ اس کا آخری سال ہے، دو تین مہینے میں پڑھ کر فارغ ہو جائے گا۔ مہربانی فرما کر اس کو داخل کر لیں ورنہ اس کا سال خراب ہو جائے گا۔

مولانا رحمانی نے فرمایا: تو کیا ناتربیت یافتہ طالب علم کو رکھ کر میں اس کو سند دے کر اس کی سند پر دستخط کروں گا کہ یہ لڑکا صحیح اعمال و اخلاق کا ہے؟ کیا میرا خون اس وقت سفید ہو جائے گا کہ ایسے باؤلے پن کو اختیار کروں اور اس کو سند دے دوں؟

(دینی تعلیم وتربیت کے اصول و آداب، ص 53)

عمدۃ الأحکام

عمدۃ الأحکام، نماز (فرض) کے بعد مسنون اذکار سے متعلق

فضل الرحمٰن حقانی، خطیب وامام محمدی مسجد نیلسن یوکے

(قسط 56)

حدیث نمبر:133

عَنْ عبداللّٰہ بن عمر رضي الله عَنْهما قال: «كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ خُطْبَتَيْنِ، وَهُوَ قَائِمٌ، يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا بِجُلُوسٍ».

(رواه البخاري، كتاب الجمعة، باب الخطبة قائماً، برقم 920، بلفظ: «كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْطُبُ قَائِمًا، ثُمَّ يَقْعُدُ، ثُمَّ يَقُومُ كَمَا تَفْعَلُونَ الآنَ»، ولفظ مسلم نحوه. وباب القعدة بين الخطبتين يوم الجمعة، برقم 928، ومسلم، كتاب الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة وما فيهما من الجلسة، برقم 861، ولمسلم لفظ: «كَانَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ خُطْبَتَانِ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ، وَيُذَكِّرُ النَّاسَ»خطبتان يجلس بينهما يقرأ القرآن، ويذكر الناس»،وفي لفظ لمسلم، برقم 35-(861):«كَانَ يَخْطُبُ قَائِمًا، ثُمَّ يَجْلِسُ، ثُمَّ يَقُومُ فَيَخْطُبُ قَائِمًا، فَمَنْ نَبَّأَكَ أَنَّهُ كَانَ يَخْطُبُ جَالِسًا فَقَدْ كَذَبَ، فَقَدْ وَاللَّهِ صَلَّيْتُ مَعَهُ أَكْثَرَ مِنْ أَلْفَيْ صَلَاةٍ»، وأما اللفظ الذي ذكره المصنف: ، فهو عند النسائي، برقم 1416)

حدیث مبارکہ کا سلیس ترجمہ:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر دو خطبے دیا کرتے تھے اور ان دونوں کے درمیان بیٹھ کر فاصلہ کرتے تھے۔

حدیث مبارکہ کے بعض الفاظ کے معانی:

1 - يَخْطُبُ: خطبہ دیتا ہے۔

2-وَهُوَ قَائِمٌ: اس حال میں کہ آپ کھڑے ہوتے۔

3-يَفْصِلُ: فاصلہ کرتے۔

4-جُلُوسٍ: بیٹھنا

حدیث مبارکہ سے حاصل ہونے والے بعض مسائل اور احکام:

1۔جمعہ کے دو خطبے واجب ہیں اس پر اجماع ہیں اور دو خطبوں کے دوران تھوڑی دیر بیٹھنا سنت ہے۔ بغیر دو خطبوں کے جمعہ کی نماز نہیں ہوگی اگر خطیب صاحب دوسرا خطبہ دینا بھول جائیں تو مقتدیوں کو چاہیے کہ خطیب صاحب کو یاد دلائیں۔ اگر کسی خطیب نے بھول کر یا غلطی سے ایک خطبہ سے جمعہ پڑھایا تو وہ جمعہ ادا نہیں ہو گا بلکہ دوبارہ دو خطبوں کے ساتھ جمعہ پڑھانا ضروری ہے۔

2۔ خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر دینا سنت ہے بیٹھ کر خطبہ جمعہ دینا درست نہیں ہے۔

3۔ خطبہ جمعہ میں نبی کریم ﷺ قرآن مجید پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے اور نصیحت تب ہی نصیحت ہوتی جب وہ لوگوں کی زبان میں ہو۔ ہمارے احناف بھائی جو عربی زبان میں انتہائی مختصر خطبہ دیتے ہیں وہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔ اور نہ ہی نبی کریم ﷺ نے جمعہ کے دن تقریر الگ کی اور دو مختصر خطبے الگ دیئے۔

4۔ بعض جہلاء دو خطبوں کا سبب حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا بچپن میں دوران خطبہ نبی کریم ﷺ کے پاس آ جانا ہے جب کہ جمعہ کی فرضیت ہجرت کے پہلے سال ہوئی ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پیدائش ہجرت کے تیسرے سال ہوئی ہے۔

حدیث نمبر:134

عَنْ أبي هريرة رضي الله عَنْه : أن النَّبِيَّ ﷺ قال : «إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ : أَنْصِتْ ـــ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالإِمَامُ يَخْطُبُ ـــ فَقَدْ لَغَوْتَ».

(رواه البخاري، كتاب الجمعة، باب الإنصات يوم الجمعة والإمام يخطب، برقم 934، ومسلم، كتاب الجمعة، باب في الإنصات يوم الجمعة في الخطبة، برقم 851، واللفظ له)

حدیث مبارکہ کا سلیس ترجمہ:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جب تم نے جمعہ کے دن جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو اپنے ساتھی سے کہا خاموش ہو جاؤ تو گویا تم نے لغو یعنی فضول اور باطل کام کیا۔“

حدیث مبارکہ کے بعض الفاظ کے معانی:

1 - إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ: جب تو نے اپنے ساتھی سے کہا۔

2-أَنْصِتْ: خاموش ہو جاؤ۔

3 - وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ: اس حال میں کہ امام خطبہ دے رہا ہو۔

4-فَقَدْ لَغَوْتَ: تو یقیناً تم نے لغو یعنی فضول / باطل کام کیا۔

حدیث مبارکہ سے حاصل ہونے والے بعض مسائل اور احکام:

1۔خطبہ جمعہ خاموشی اور توجہ سے سننا واجب ہے۔

2۔دوران خطبہ مقتدیوں کا کسی طرح کی گفتگو کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ایسا کرنے سے حدیث رسول ﷺ کے مطابق جمعہ کے خطبہ کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔ البتہ مقتدی امام سے اور امام مقتدی سے ضرورت کے بات کرسکتے ہیں۔

4۔بعض احناف بھائی یہ کہتے ہیں کہ جب معمولی بات بھی خطبہ جمعہ کے دوران نہیں کی جاسکتی ہے تو دو رکعت پڑھنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ سے یہ اجازت ثابت ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ انسانی گفتگو کو لغو اور باطل کہا جاسکتا ہے مگر نماز کو لغو، فضول یا باطل نہیں کہا جاسکتا ہے۔

4۔یہ حکم صرف خطبہ جمعہ کے لیے خاص ہے عام دروس، خطبات وغیرہ میں یہ حکم نہیں ہے البتہ عام گفتگو کو بھی خاموشی اور توجہ کے ساتھ سننا اچھے اخلاق میں سے ہے۔

5۔خطبہ جمعہ کے دوران سلام کرنا اس کا جواب دینا چھینک کی دعا اور اس کا جواب دینا جائز ہے البتہ مصافحہ یا حال احوال پوچھنا ممنوع ہے۔

☆☆☆

تکمیل حفظ قرآن مجید

گزشتہ دنوں 'ماوی بنت عبد الفتاح' برمنگھم نے 13 سال کی عمر میں حفظ قرآن مکمل کر لیا، اسی مناسبت سے مبارکباد دینے کے لیے بہت سے احباب واقارب محمد عبد الفتاح کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ ڈاکٹر عبد الرب ثاقب نے اسی مناسبت سے دو قطعات پیش کیے، حافظۂ قرآن کے دادا جان مولانا محمد عبد الهادی العمری نے نگرانی کی اور دعا کی۔

آخر میں تمام حاضرین کے لیے بہترین طعام سے ضیافت کی گئی۔ اللہ کریم حافظہ کو باعمل بنائے۔ آمین یارب العالمین

ماویٰ فتاح نے یوں حفظ قرآن کر لیا\
نور سب رحمٰن کا سینے میں اپنے بھر لیا\
عبد الهادی دادا، دادی اور ان کے والدین\
نانا نانی نے ادا بھی شکر رب کا کر لیا

حافظۂ قرآن ماویٰ کی دادی جان ہیں\
چاچا اور پھوپھا بھی ان کے حافظِ قرآن ہیں\
ہیں مبارکباد کے قابل یہ حفاظ کرام\
فضل سے اللہ کے ہے نیک یہ گھر بھر تمام

ماویٰ کے والدین انجینئر حافظ عمار عبد الهادی

مولانا عبد حافظ عبد الباسط العمری

☆☆☆

انتقال پرملال

برمنگھم میں سمأ پرفیوم، کے قاری سید یعقوب علی کی ہمشیرہ حیدر آباد دکن بعمر 66 سال قضائے الٰہی سے وفات پاگئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مرحومہ نیک سیرت اور پابند صوم وصلوٰۃ تھیں، وفات کی رات بھی تہجد پڑھ کر نماز فجر ادا کی اور خاموشی سے راہ بقا اختیار کی۔ حیدر آباد میں ان کے ایک بھائی قاری سید اسحاق علی اور تمام بہنیں اور اقارب غمزدہ اور دعا گو ہیں کہ اللہ کریم مرحومہ کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے۔ آمین

جانے والے کبھی نہیں آتے\
جانے والوں کی یاد آتی ہے

☆☆☆

بندے اور توبہ کے درمیان رکاوٹ کا حائل ہونا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ﴾

"اور ان کے درمیان اور ان کی خواہشات کے درمیان پردہ ڈال دیا گیا(رکاوٹ کھڑی کر دی گئی)۔" (سورہ سبا:54)

بعض سلف صالحین (امت کے بزرگوں) نے اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ

ان کی سب سے بڑی خواہش اس وقت 'توبہ' تھی، لیکن موت کے آخری لمحات میں ان کے اور توبہ کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی گئی۔ یعنی اب توبہ کا وقت گزر چکا تھا۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اتق الله يا ابن آدم ؛ لا يجتمع عليك خصلتان : سكرة الموت ، وحسرة الفوت"

"اے ابنِ آدم! اللہ سے ڈر؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھ پر دو حالتیں ایک ساتھ جمع ہو جائیں: موت کی سختی (سکرۃ الموت) اور موقع نکل جانے کی حسرت (حسرۃ الفوت)۔"(تفسیر ابن رجب:456)

☆☆☆

ابراہیم الخواص رحمہ اللہ نے فرمایا:

"دل کی دوا پانچ چیزیں ہیں:

1۔قرآن کو غور و فکر کے ساتھ پڑھنا،

2۔پیٹ کو (کم کھانے کے ذریعے) خالی رکھنا،

3۔رات کو قیام کرنا،

4۔سحر کے وقت عاجزی کے ساتھ دعا کرنا،

5۔اور نیک لوگوں کی مجلس اختیار کرنا۔"

(حلیۃ الاولیاء)

☆☆☆



قرآنی اصطلاحات میں معصیت کا تصور لغوی تشریحات اور فکری و اخلاقی پہلو

ابوطیب لقمان (پی ایچ ڈی سکالر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد)

حمد و صلوٰۃ کے بعد! قرآنِ کریم اللہ رب العزت کا وہ معجز کلام ہے جس کا ہر لفظ حکمت و دانائی کے ایک بحر بیکراں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ کتاب محض احکامات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی روح کے تزکیے اور فہم و ادراک کی بالیدگی کا بہترین ذریعہ ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ اسلوبِ بیان نہایت منفرد ہے کہ وہ انسانی لغزشوں، کوتاہیوں اور نافرمانیوں کے لیے صرف ایک لفظ استعمال نہیں کرتا، بلکہ گناہ کی ماہیت، اس کے نفسیاتی محرکات اور انفرادی و اجتماعی اثرات کے لحاظ سے متنوع اصطلاحات اختیار کرتا ہے۔ قرآنِ کریم اللہ رب العزت کا وہ معجز کلام ہے جس کا ہر لفظ حکمت و دانائی کے ایک بحر بیکراں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ کتاب محض احکامات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی روح کے تزکیے اور فہم و ادراک کی بالیدگی کا بہترین ذریعہ ہے۔

سلفِ صالحین کا یہ منہج رہا ہے کہ وہ قرآن کی ان باریک بینیوں پر غور کرتے تھے تاکہ یہ جان سکیں کہ خالقِ کائنات بندے کو کس طرح کی تنبیہ فرما رہا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ہم گناہ کے لیے استعمال ہونے والی چیدہ چیدہ قرآنی تعبیرات، ان کے لغوی مفاہیم اور ان کے پیچھے کارفرما اخلاقی مقاصد کا علمی جائزہ لیں گے۔

1۔ اِثم: روحانی سستی اور نیکیوں سے محرومی قرآنِ مجید میں گناہ کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ "اِثم" ہے۔ استعمال کی وجہ اور مقصد: اللہ تعالیٰ نے گناہ کو اثم اس لیے کہا تاکہ بندے کو یہ احساس دلایا جائے کہ گناہ صرف ایک قانون شکنی نہیں بلکہ یہ وہ بوجھ ہے جو آپ کے پاؤں میں زنجیر بن کر آپ کو جنت کے راستے میں پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ امام راغب اصفہانی "المفردات فی غریب القرآن" میں رقمطراز ہیں کہ لغتِ عرب میں اِثم اس کام کو کہتے ہیں جو انسان کو نیکی کی راہ میں سست کر دے اور اسے ثواب سے محروم کر دے۔ یہ لفظ اس اونٹنی کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا جو اپنی سستی کی وجہ سے قافلے سے پیچھے رہ جائے۔ استعمال کی وجہ اور مقصد: اللہ تعالیٰ نے گناہ کو اِثم اس لیے کہا تاکہ بندے کو یہ احساس دلایا جائے کہ گناہ صرف ایک قانون شکنی نہیں بلکہ یہ وہ بوجھ ہے جو آپ کے پاؤں میں زنجیر بن کر آپ کو جنت کے راستے سے پیچھے دھکیل دیتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (سورۃ الاعراف:33)

اخلاقی پیغام: اس تعبیر کا مقصد یہ ہے کہ مومن اپنی زندگی کا محاسبہ کرے کہ اگر اسے نماز، تلاوت یا دیگر عبادات میں بوجھ اور سستی محسوس ہو رہی ہے، تو یقیناً اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی "اِثم" کارفرما ہے جس نے اس کی روحانیت کو مفلوج کر دیا ہے۔

گناہ کے انجام کی سنگینی اور فکری بیداری

2۔ ذَنب: انجام کی سنگینی اور دائمی وبال لفظ "ذنب" کا مادہ "ذَنَب" ہے جس کے لغوی معنی "پونچھ" کے ہیں۔ اہلِ لغت کے مطابق یہ لفظ ایسے گناہ کے لیے بولا جاتا ہے جس کا وبال اور برا انجام انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ استعمال کی وجہ اور مقصد: اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے گناہ کو ذنب اس لیے پکارا تاکہ انسان کو یہ تنبیہ کی جائے کہ گناہ کوئی وقتی لذت نہیں جو ختم ہو گئی، بلکہ اس کا انجام پونچھ کی طرح تمہارے نامہ اعمال کے ساتھ جڑا رہے گا یہاں تک کہ توبہ اسے کاٹ نہ دے۔ قرآنِ کریم میں سابقہ امتوں کی ہلاکت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ﴾ (سورۃ الانعام:6)

اخلاقی پیغام: اس کا مقصد انسان کے اندر "فکرِ آخرت" پیدا کرنا ہے۔ یہ تعبیر ہمیں سکھاتی ہے کہ گناہ کو چھوٹا نہ سمجھو، بلکہ یہ دیکھو کہ اس کا انجام تمہارا پیچھا کر رہا ہے جو دنیا سے لے کر قبر اور حشر تک تمہارے ساتھ رہے گا۔

3۔ سیئۃ: بدنمائی اور معاشرتی فساد یہ لفظ "سوء" سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی بدصورتی، تکلیف یا ایسی چیز کے ہیں جو دیکھنے میں ناگوار گزرے۔ قرآن جب گناہ کو سیئۃ کہتا ہے تو اس کا رخ گناہ کی اس ظاہری اور باطنی قباحت کی طرف ہوتا ہے جو انسانی فطرت کو مکدر کر دیتی ہے۔

اگر تم اپنی انسانیت کی توہین محسوس کرتے ہو، تو یہ "ظلم" ہے۔ اگر تم معاشرے میں بگاڑ کے ذمہ دار ہو، تو یہ "سیئۃ" ہے۔ مغربی معاشرے کے پرفتن ماحول میں، جہاں گناہ کو ذاتی پسند یا طرزِ زندگی جیسے خوشنما پردوں میں چھپایا جاتا ہے، وہاں ایک مسلمان کے لیے ان قرآنی اصطلاحات کا فہم ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ الفاظ ہمیں بتاتے ہیں کہ گناہ صرف ایک فعل نہیں بلکہ ایک ایسا بوجھ ہے جو ہماری روحانی ترقی کو روک دیتا ہے۔ تاہم، قرآن کا کمال یہ ہے کہ وہ

صرف بیماری کی تشخیص نہیں کرتا بلکہ توبہ کی صورت میں اس کا علاج بھی بتاتا ہے۔ گناہ کی ہر قسم، چاہے وہ کتنا ہی بڑا ظلم کیوں نہ ہو، اللہ کی رحمت اور سچی توبہ کے سامنے مٹ جاتی ہے۔ استعمال کی وجہ اور مقصد: اس تعبیر کا مقصد انسان کی "جمالیاتی حس" کو جھنجھوڑنا ہے کہ گناہ انسان کی شخصیت کے حسن کو غارت کر دیتا ہے اور معاشرے کے چہرے پر ایک بدنما داغ بن جاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿مَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (سورۃ القصص:84)

اخلاقی پیغام: جس طرح ایک سلیم الطبع انسان اپنے لباس پر معمولی سا دھبہ برداشت نہیں کرتا، اسی طرح ایک صاحبِ ایمان کو اپنے کردار پر "سیئۃ" کا داغ برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تعبیر معاشرتی پاکیزگی اور اخلاقی حسن و جمال کا درس دیتی ہے۔

4۔ ظلم: حق کی پامالی اور توازن کا بگاڑ ظلم کا لغوی معنی ہے "کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر کسی غیر محل پر رکھ دینا"۔ قرآنِ مجید نے گناہ کو سب سے زیادہ "ظلم" کی تعبیر سے واضح کیا ہے۔

استعمال کی وجہ اور مقصد: گناہ کو ظلم کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بندہ یہ جان لے کہ اس نے اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں (ہاتھ، پاؤں، آنکھ، وقت) کو ان کے اصل مقصد یعنی اطاعت سے ہٹا کر معصیت میں لگا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (سورۃ لقمان:13)

اخلاقی پیغام: یہاں "ظلم علی النفس" کا تصور ابھارا گیا ہے کہ گناہ گار کسی اور کا نہیں بلکہ اپنی ہی جان کا دشمن ہے۔ جب انسان گناہ کرتا ہے تو وہ عدل کے دائرے سے نکل کر اپنی روح پر ناانصافی کرتا ہے اور اسے عذابِ الٰہی کا مستحق بنا لیتا ہے۔

5۔ فاحشہ: حد سے تجاوز اور بے حیائی وہ گناہ جو اپنی برائی اور قباحت میں حد سے گزر جائیں، قرآن انہیں "فاحشہ" کہتا ہے۔ لغت میں "فحش" کا معنی ہی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

استعمال کی وجہ اور مقصد: اس تعبیر کا مقصد ان گناہوں کی سنگینی کو واضح کرنا ہے جو انسانی غیرت اور معاشرتی اقدار کے منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعمال کر کے مومن کے دل میں ان گناہوں کے لیے نفرت پیدا کی ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ (سورۃ الانعام:151)

اخلاقی پیغام: "فاحشہ" کی اصطلاح ہمیں "سدِ ذرائع" کا درس دیتی ہے، یعنی گناہ سے تو بچنا ہی ہے لیکن اس کے قریب لے جانے والے راستوں اور اسباب سے بھی اجتناب لازم ہے۔ برمنگھم جیسے مغربی معاشرے میں جہاں فحاشی کو آزادی کا نام دیا جاتا ہے، وہاں قرآن کا یہ لفظ ایک مسلمان کے لیے حصارِ ایمان کی حیثیت رکھتا ہے۔

اخروی سفر کی رکاوٹیں اور گناہوں کا بوجھ

6۔ وزر: کمر توڑ دینے والا بوجھ لفظ "وزر" کے معنی اس بھاری بوجھ کے ہیں جو انسان کی پیٹھ پر لدا ہو۔ قرآنِ کریم نے گناہوں کو بوجھ سے تعبیر کر کے انسان کی آخرت کی سنگینی کو واضح کیا ہے۔

استعمال کی وجہ اور مقصد: اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ گناہ انسان کو روحانی طور پر سبک رفتار نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے بوجھل بنا دیتے ہیں۔ جس طرح بوجھ والا مسافر منزلِ مقصود تک جلدی نہیں پہنچ پاتا، اسی طرح گناہ گار انسان آخرت کے کٹھن سفر میں تھک کر رہ جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ﴾ (سورۃ الانعام:31)

اخلاقی پیغام: یہ تعبیر زہد اور تقویٰ کی ترغیب دیتی ہے کہ جتنا دامن گناہوں کے بوجھ سے پاک ہو گا، اللہ کی ملاقات کا سفر اتنا ہی سہل اور پر کیف ہو گا۔

7۔ خطیئۃ: شعوری لغزش اور محاصرہ "خطیئۃ" اس گناہ کو کہتے ہیں جو انسان سے شعوری طور پر سرزد ہو اور وہ اس میں ایسا مگن ہو جائے کہ نیکی کے راستے بند ہو جائیں۔

استعمال کی وجہ اور مقصد: اللہ تعالیٰ نے گناہ کے تسلسل اور اس کی ہلاکت خیزی کو واضح کرنے کے لیے یہ لفظ منتخب کیا ہے۔ جب انسان گناہ کو معمولی سمجھ کر اس پر اصرار کرتا ہے تو وہ گناہ اسے ہر طرف سے گھیر لیتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ﴾ (سورۃ البقرۃ:81)

اخلاقی پیغام: یہ تعبیر ہمیں گناہوں کے عادی ہونے سے ڈراتی ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گناہ دل کو اسی طرح زنگ آلود کر دیتا ہے جیسے لوہے کو پانی۔ "خطیئۃ" وہ حالت ہے جہاں انسان کا ضمیر مردہ ہونے لگتا ہے۔

حرفِ آخر اور پیغامِ دعوت قرآنِ مجید کی ان متنوع اصطلاحات اور تعبیرات کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ دینِ اسلام گناہ کو محض ایک قانونی جرم نہیں سمجھتا بلکہ اسے انسانی روح کی بیماری قرار دیتا ہے۔ اللہ رب العزت نے گناہ کے مختلف نام رکھ کر ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ

- اگر تم نیکی کی لذت سے محروم ہو، تو یہ "اِثم" ہے۔
- اگر تم برے انجام سے ڈرتے ہو، تو یہ "ذنب" ہے۔
- اگر تم اپنی انسانیت کی توہین محسوس کرتے ہو، تو

یہ "ظلم" ہے۔

- اگر تم معاشرے میں بگاڑ کے ذمہ دار ہو، تو یہ "سیئۃ" ہے۔

"صراطِ مستقیم" کے قارئین، بالخصوص دیارِ غیر میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے ان تعبیرات کا فہم اس لیے ضروری ہے کہ وہاں ہر گناہ کو ایک خوشنما نام دے کر پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن ہمیں برائی کی اس کی اصل حقیقت کے ساتھ پہچان کرواتا ہے۔ سلفِ صالحین کا یہی شیوہ تھا کہ وہ گناہ کو چھوٹا نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس کی عظمت کو دیکھتے تھے جس کی نافرمانی کی جارہی ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قرآنِ کریم کا وہ فہمِ سلیم عطا فرمائے جو ہمارے کردار کی اصلاح کا ذریعہ بنے۔ ہمیں گناہوں کی ظاہری و باطنی ہلاکت خیزیوں سے محفوظ رکھے، ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کے نور سے منور فرمائے اور ہمیں ان لوگوں میں شامل کرے جن کے نامہ اعمال گناہوں کے بوجھ سے پاک ہو کر توبہ کے نور سے چمک رہے ہوں۔

آمین یارب العالمین!

☆☆☆

علمائے عزیز کے نام ایک پیغام

تم اپنا فرض جو علمائے دین پہچانو
جہانِ تیرہ و تاریک کیوں نہ روشن ہو
بھٹک رہا ہے اندھیروں میں کاروانِ اُمم
سنبھالے کون اسے تم اگر نہ خضر بنو
تمہارے سامنے فکر و نظر کے خاکے ہیں
یقین وحسنِ عمل سے تم ان میں رنگ بھرو
ہے کب سے ملتِ بیضا تباہ و سرگرداں
خبر بھی ہے تمہیں اے شمع دیں کے پروانو
ہزار بدلے، زمانے کا رنگ ڈھنگ مگر
تم اپنی وضع نہ چھوڑو کبھی نہ تم بدلو
کوئی بھی تم کو جہاں میں ڈرا نہیں سکتا
جو تم خدائے علیم و خبیر ہی سے ڈرو
تمہاری راہ نمائی کا منتظر ہے وہ
اٹھو! زمانے کو تم اپنے ساتھ لے کے چلو
تمام عمر بلا خوف لومۃ لائم
خدا کی جس میں رضا ہو نہاں وہ کام کرو
ادھر ہے راحتِ دنیا ، ادھر صعوبتِ دیں
تم اس دوراہے پہ جاؤ گے کس طرف بولو
کلی کلی ہے فسردہ ہر ایک پھول ملول
تم اپنے خوں سے گلستانِ دین کو سینچو
یہ درس گاہ حقیقت میں تربیت گہ ہے
نہ بن سکو گے کہیں تم اگر یہاں نہ بنو
کہاں ہوا ہے سویرا ، ابھی اندھیرا ہے
مثالِ مہر درخشاں جہاں میں تم چمکو
پہنچ ہی جاؤ گے اک روز تم سرِ منزل
دلوں کے ساتھ قدم، بھی ذرا ملا کے چلو
کرو حفاظت ناموس دین و ملّت تم
ابوالبیاں کا یہ پیغامِ شوق یاد رکھو

مولانا ابوالبیان حمادی العمری

☆☆☆

ماہ شوال کے چھ دن کے روزوں کی فضیلت وثبوت

عن ابي ايوب قال: قال النبي ﷺ: «من صام رمضان ثم اتبعه ستا من شوال فذلك صيام الدهر» (جامع ترمذی:759)

سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد شوال کے چھ (نفلی) روزے رکھے تو یہی صوم الدھر ہے۔" اس حدیث کو درج کرنے کے بعد امام ترمذی فرماتے ہیں کہ جناب حسن بصری کے پاس جب شوال کے چھ دن کے روزوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتے: اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ اس ماہ کے روزوں سے پورے سال راضی ہے۔"

مزید لکھتے ہیں: وقد استحب قوم صيام ستة ايام من شوال بهذا الحديث قال ابن المبارك: هو حسن هو مثل صيام ثلاثة ايام من كل شهر قال ابن المبارك: ويروى في بعض الحديث ويلحق هذا الصيام برمضان واختار ابن المبارك ان تكون ستة ايام في اول الشهر وقد روي عن ابن المبارك انه قال: إن صام ستة ايام من شوال متفرقا فهو جائز

کئی ائمہ نے اس حدیث کی رو سے شوال کے چھ دن کے روزوں کو مستحب کہا ہے، ابن مبارک کہتے ہیں: یہ اچھا ہے، یہ ہر ماہ تین دن کے روزوں کے مثل ہیں، اور عبد اللہ ابن مبارک کہتے ہیں: بعض احادیث میں مروی ہے کہ یہ روزے رمضان سے ملا دیئے جائیں، -۔ اور ابن مبارک نے پسند کیا ہے کہ یہ روزے مہینے کے ابتدائی چھ دنوں میں ہوں، ۱۱- ابن مبارک سے نے یہ بھی کہا: اگر کوئی شوال کے چھ دن کے روزے الگ الگ دنوں میں رکھے تو یہ بھی جائز ہے۔

(صحیح مسلم:29، (1164؛ تحفۃ الأشراف:3482)

شرح: "ایک نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ہے" کے اصول کے مطابق رمضان کے روزے دس مہینوں کے روزوں کے برابر ہوئے اور اس کے بعد شوال کے چھ روزے اگر رکھ لیے جائیں تو یہ دو مہینے کے روزوں کے برابر ہوں گے، اس طرح اسے پورے سال کے روزوں کا ثواب مل جائے گا، جس کا یہ مستقل معمول ہو جائے اس کا شمار اللہ کے نزدیک ہمیشہ روزہ رکھنے والوں میں ہو گا، شوال کے یہ روزے نفلی ہیں انہیں متواتر بھی رکھا جا سکتا ہے اور ناغہ کر کے بھی، تاہم شوال ہی میں ان کی تکمیل ضروری ہے۔



انشورنس؛ بعض اقسام واحکام

ڈاکٹر سید حسین مدنی (مؤسس ادارۂ کل ہند تحقیقات علمیہ وصدر فتوی بورڈ تلنگانہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الأمين وعلى آله وصحبه أجمعين

تمہید: دورحاضر میں انشورنس کا موضوع اس لیے اہم ہے، کیونکہ اللہ نے باطل ذریعے سے مال کھانے سے منع کیا اور فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾

"اے ایمان والو! اپنے آپسی مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ مگر یہ کہ خرید و فروخت تمہاری آپسی رضامندی سے ہو۔" (سورۃ النساء:29)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَ أَنْفَقَهُ »

"(روز قیامت سوال ہوگا کہ) اپنا مال کہاں سے کمایا اور اسے کہاں پر خرچ کیا؟" (جامع ترمذی، ابواب الصفۃ، باب فی القیامۃ:2416)

انشورنس کا موضوع اس قدر طویل اور اہم موضوع ہے کہ جس کی صرف ایک شکل تعاونی ہیلتھ انشورنس پر جامعۃ الملک میں ماجستیر Master's degree کی گئی اور صرف ہیلتھ انشورنس پر جامعہ الامام میں دکتوراہ Doctorate کیا گیا۔

انشورنس کا موضوع اس قدر پیچیدہ اور قابل احتیاط بھی ہے کہ شیخ صالح بن حمید حفظہ اللہ جیسے جید و متبحر عالم نے کچھ دن پہلے فرمایا کہ میرے پاس انشورنس کی بعض شکلوں کا مکمل تصور نہیں۔

مفہوم وابتدا: انشورنس کو ہندی اور اردو میں بیمہ اور جدید عربی میں تامین کہا جاتا ہے، اور قدیم علما نے انشورنس کو سوکرہ کا نام دیا جو SECURITY کا معرب ہے اور تجارتی انشورنس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو کسی تحفظ یا تلافی نقصان کی غرض سے یک مشت یا اقساط پر مخصوص اور متعین رقم فراہم کرتا ہے اور دوسرا فریق اس کے عوض حسب معاہدہ بھی رقم تو کبھی کوئی شے تو کبھی کوئی خدمت ومنفعت فراہم کرتا ہے اور کبھی کچھ کمپنیوں اور حکومتوں کی جانب سے اپنے ملازمین و باشندوں کے لیے فریق ثالث کے طور پر رقم کی ادائی ہوتی ہے۔

انشورنس کی ابتدا تو سمندری تجارتی سفر کو محفوظ بنانے کی غرض سے چودہویں صدی عیسوی میں جنوبی یورپ کے ملک اٹلی ITALY میں ہوئی، لیکن انشورنس کی شکلیں بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں متعارف ہوئیں اور اس سے متعلق پہلا قانون بھی اسی وقت Germany میں بنا۔

انشورنس کے موضوع پر عدم گفتگو متاخرین فقہاء میں سب سے پہلے امام ابن عابدین دمشقی (ت 1252) نے کی اور دیار اسلام میں نہیں بلکہ صرف دار الحرب میں حربی کی رضامندی سے سوکرہ کا مال لینے کی اجازت دی۔ (حاشیہ ابن عابدین رد المحتار:4/170)

انشورنس کی اقسام: انشورنس کا تعلق فقہ النوازل والمستجدات سے ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ الاقلیات، فقہ المآلات، فقہ الاولویات، فقہ الموازنات اور فقہ الواقع سے بھی ہے۔

علمی و اصولی اور فرضی طور پر انشورنس کی متعدد قسمیں بتائی گئیں، لیکن بنیادی طور پر رائج یا علماء کے یہاں معروف دوبڑی قسمیں ہیں:

1۔تعاونی 2۔تجارتی۔

تعاونی Cooperative انشورنس: فریق اول کی جانب سے کسی بھی طرح سے رقم کی ادائی کے بغیر انشورنس اگر حکومت یا اصحاب خیر کی جانب سے تعاونی Cooperative ہو تو شیخ عبد اللہ بن منیع حفظہ اللہ کے علاوہ سب کے یہاں متفقہ طور پر جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى ﴾ (سورۃ المائدہ:2)

"اور تم نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤ" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْأَشْعَرِيِّينَ إِذَا أَرْمَلُوا فِي الْغَزْوِ أَوْ قَلَّ طَعَامُ عِيَالِهِمْ بِالْمَدِينَةِ جَمَعُوا مَا كَانَ عِندَهُمْ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ ثُمَّ اقْتَسَمُوهُ بَيْنَهُمْ فِي إِنَاءٍ وَاحِدٍ بالسوية» (صحیح بخاری:2354)

"اشعری قبیلے کا توشہ میدان جنگ میں جب ختم ہو جاتا یا مدینے میں ان کے اہل خانہ کا غلہ کم پڑ جاتا تو وہ ایک کپڑے میں اپنی ساری پونجی اکٹھا کر لیتے، پھر ایک برتن سے اسے برابر برابر اپنے درمیان تقسیم کر دیتے۔

تجارتی Commercial انشورنس: انشورنس اگر تجارتی Commercial ہو تو اس کی فقہی تکییف و تصویر کرنے میں اختلاف کی بنا پر حکم بیان کرنے میں بھی اجتہادی اختلاف پایا جاتا ہے۔

بلاد اسلامیہ یا غیر بلاد اسلامیہ کی تمیز و تفریق کے بغیر

جمہور اور بیشتر اہل علم نے بالخصوص مجمع الفقہ الإسلامی الدولی International Islamic Fiqh Academy کی اکثریت ہیئۃ کبار العلماء سعودیہ لجنۃ دائمہ للبحوث العلمیہ والافتاء سعودیہ امریکی مجمع فقہاء الشریعۃ شیخ ابن عثیمین، شیخ البانی، شیخ بن باز سابق مفتی دیار مصر شیخ محمد بیت المطیعی اور ملک شام کے معاصر فقیہ دکتور وہبہ زحیلی رحمہم اللہ دیگر نے تجارتی انشورنس کو کئی وجوہات کے پیش نظر حرام قرار دیا، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

1۔ غرر اور ضرر: تجارتی انشورنس میں غرر Uncertainty اور ضرر پایا جاتا ہے اور انشورنس میں عقود کی مکمل وضاحت اور پابندیوں کی صراحت نہیں ہوتی، اس لحاظ سے اس نوعیت والا معاملہ منع ہے کیونکہ نبی ﷺ نے:

" نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ ... عَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ "

"نبی ﷺ نے غرر والے معاملے سے منع کیا۔" (صحیح مسلم، کتاب البیوع:1513)

غرر یعنی جہل اور معاملہ کی عدم شفافیت ہے اور کبھی غرر دھوکے یا دھوکے کے شبہ اور خطرے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور انشورنس میں غرر غرر فاحش یعنی بے تحاشا ہے، اس اعتبار سے کہ انشورنس کرانے والے کو ضرورت پڑے گی یا نہیں، اگر پڑے گی تو کم ہوگی یا زیادہ ہوگی، ضرورت نہ پڑنے یا کم پڑنے کی صورت میں انشورنس کرانے والے کو نقصان ہوگا اور ضرورت زیادہ پڑنے کی صورت میں کمپنی کو نقصان ہوگا۔

2۔ میسر و قمار اور رہان یا مراہنہ : قمار۔۔جوا۔۔ Gambling کی شکل ہے، اس لحاظ سے کہ انشورنس کرانے والا کبھی بغیر غلطی اور بغیر زیادتی رقم ادا کر کے نقصان میں رہتا ہے اور فائدہ نہیں اٹھا پاتا، تو کبھی کمپنی بغیر محنت فائدے میں رہتی ہے اور جب بھی اس طرح سے معاملہ داری میں جہالت اور لاعلمی یقینی طور پر ہو تو وہ میسر قمار اور جوا شمار ہوتا ہے، جس سے اللہ نے منع فرمایا اور جب منع فرمایا تو اس قمار کو شراب اور بت پرستی کے ساتھ ذکر کیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ 0 إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ﴾

"اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب جوا تھان اور فال نکالنے کے تیر یہ سب گندی باتیں اور شیطانی حرکتیں ہیں، لہٰذا ان کاموں سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح یاب ہو، شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے آپس میں بغض و دشمنی ڈال دے اور اللہ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے تو کیا تم باز آنے والے ہو؟"

اور یہ انشورنس اُس رہان یا مراہنہ یعنی شرط لگانا داؤ لگانا یا سٹے بازی Betting کی شکل بھی ہے جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا سَبَقَ إِلَّا فِي خُفٍّ أَوْ حَافِرٍ أَوْ نَصْلٍ »(سنن ابوداود، کتاب الجہاد، باب فی السبق:2574)

"شرطیہ مقابلہ صرف اونٹوں اور گھوڑوں کے مقابلے اور تیر اندازی کے مقابلے ہی میں درست ہے۔"

3۔ باطل ذریعے سے مال کمانا: انشورنس میں طرفین دلی اور حقیقی رضامندی کے بغیر ناحق اور باطل ذریعے سے Unlawfully /Unjustly مال کماتے اور کھاتے ہیں، جب کہ اللہ نے اسے فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾

"اے ایمان والو! تم آپس میں اپنا مال باطل ذریعے سے نہ کھاؤ۔" (سورۃ النساء:29)

4۔ ربا: انشورنس کی غرض سے کمپنی کو مال کم دیا جاتا ہے، لیکن واپس زیادہ لیا جاتا ہے یا قسط وقت پر ادا نہ کرنے کی صورت میں کمپنی کو زائد رقم دینی پڑتی ہے تو یہ ربا الفضل ہے اور کمپنی وہی رقم بعد میں ادا کرتی ہے تو یہ ربا النسیئۃ ہے اور اگر کمپنی زائد رقم بعد میں ادا کرتی ہے تو ایسی صورت میں ربا الفضل اور ربا النسیئۃ دونوں بھی پائے جاتے ہیں۔

انشورنس کمپنیاں اپنی آمدنی کی رقم سودی معاملات میں لگاتی ہیں اور سودی منافعے سے اپنا کام کرتی ہیں، جب کہ اللہ نے سود کو حرام قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (سورۃ البقرہ: 275)"اللہ نے تجارت حلال کی اور سود حرام کیا۔"

تنبیہ: بالخصوص اس تعلیل و توجیہ سے دیگر اہل علم نے اختلاف کیا کیوں کہ لائف انشورنس کے علاوہ دیگر قسموں میں پیسے کا تبادلہ پیسے سے نہیں ہوتا بلکہ کبھی ٹھوس چیز Commodity تو کبھی منفعت و خدمت Service سے ہوتا ہے جو کہ سود نہیں۔

کچھ دیگر افراد جیسے شامی عالم مصطفی زرقاء رحمہ اللہ، باحث مجمع الاسلامي الدولي، مصری فقیہ عبد الوہاب خلاف رحمہ اللہ و دیگر نے عمومی طور پر تجارتی انشورنس کو جائز قرار دیا، کیونکہ ان کے یہاں جواز کی چودہ سے زائد وجوہات ہیں، جن میں کچھ نمایاں وجوہات درج ذیل ہیں:

اعتبار اصل: معاملات میں اصل اباحت ہے اور انشورنس کی حرمت منصوص نہیں۔

باہمی تعاون: انشورنس نیکی اور پرہیز گاری میں تعاون کی بنیاد پر قائم ہے۔ (جاری ہے)

☆☆☆



"علماء" اللہ کے دین کے جاننے والے، قرآن وسنت کا فہم وادراک رکھنے والوں کو کہتے ہیں، جو اللہ اور اس کے نبی ﷺ کی دی گئی تعلیمات کا تحفظ کرتے ہیں اور نبی کی اُمت کو راہ راست پر چلاتے ہیں اور صراط مستقیم پر استقامت کی تلقین کرتے ہیں، دین کو شرک وبدعات وخرافات کی گندگی سے محفوظ رکھتے ہیں، نبی کے بعد قوم وملت کی قیادت کے یہی حقدار ہیں اور جب تک لوگ علماء کو اپنا رہنما ور ہبر بنا کر چلتے رہیں گے ترقی وعروج پر رہیں گے جب وہ اپنے علماء کو چھوڑ دیں گے تو گمراہیوں کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

علماء کی فضیلت

رسول اللہ ﷺ نے علماء کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: «إنّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الانبياء» "بیشک علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔" (جامع ترمذی: 2682، صحیح؛ سنن ابوداؤد: 3641)

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ «العُلَمَاءُ خُلَفَاءُ الانبياء» "علماء انبیاء کے خلیفہ ہیں۔" (مجموع الزوائد: 1/131؛ مسند بزار: 4145)

انبیاء دنیاوی ساز وسامان، مال دولت کے وارث نہیں ہوتے بلکہ وہ علم کے وارث ہوتے ہیں اس حیثیت سے نبی ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات کے حقیقی وارث علماء ہی ہیں، اس کا تحفظ کرنا اور اس کی نشر واشاعت کی ذمہ داری انہی کے کندھوں پر عائد ہوتی ہے اور جب علماء روٹی، کپڑا اور مکان کی دنیا میں الجھ جائیں گے تو دین کا تحفظ مشکل میں پڑ جائے گا، جیسا کہ ہم فی زمانہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں، اسی لئے قوم وملت کو ایک قائد ور ہبر فراہم نہیں ہو رہا ہے۔ جب کوئی بندہ علم دین سیکھنے کے لئے اپنا گھر بار اور خوش حالی و آسائش ترک کر کے مدارس اسلامیہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بھوک پیاس، افلاس و تنگدستی کے باعث مدرسہ چلا گیا بلکہ یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دین کے تحفظ کے لئے منتخب کیا ہے اور یہ توفیق الٰہی ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی، اسی لئے دین کے طالب علم کو حقیر سمجھنا یا انہیں کمتر جاننا در اصل رسول اللہ ﷺ کے وارثین کو حقارت بھری نظروں سے دیکھنا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے علماء کو بڑی فضیلت عطا فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ﴾

"یقیناً اللہ کے تمام بندوں میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے علماء ہی ہوتے ہیں۔" (سورہ فاطر: 28)

اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿كُونُوا رَبَّانِيِّينَ ﴾

"تم سب ربانی بن جاؤ۔" (سورہ آل عمران: 79) اہل علم نے اس سے مراد علماء وفقہا بتایا ہے۔

علماء کی اہمیت وفضیلت اس حدیث سے جانی جا سکتی ہے کہ جس میں ارشاد ہے:

« عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيل »

"میری امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کی طرح ہیں۔" (السلسلہ الصحیحہ: 6.369)

اگر چہ کہ اس حدیث کے متعلق بہت سے محدثین نے لکھا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے اس کو امام ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے " السلسلہ الصحیحہ اور السلسلۃ الضعیفہ دونوں میں ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے ظاہری الفاظ سے خود علماء کو اپنا مقام ومرتبہ اور اپنی اہمیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ علماء کے فضائل میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں سے اکثر تو موضوع احادیث ہیں اور بعض ضعیف احادیث بھی ہیں اور چند احادیث صحیح درجے کی ہیں۔

ایک حدیث میں ہے جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ « العُلَمَاءُ مَصَابِيح الأَرْضِ ، وَخُلَفَاءِ الأَنْبِيَاءِ ، وَوَرَثَتِي وَوَرَثَةُ الانْبِيَاءِ» "علماء زمین کے چراغ ہیں، اور انبیاء کے خلیفہ ہیں اور میرے اور دیگر انبیاء کے وارث ہیں۔" (کشف الخفاء 2-84: صحیح)

علماء کی تعریف شعراء کی زبانی:

علماء کے علم اور ان کی قدر ومنزلت کو شعرائے کرام نے بڑے ہی خوب انداز میں بیان کیا ہے ایک شاعر کہتا ہے:

عالم ہے کیا؟ یہ باب فصاحت میں دیکھئے
تقوی کو اس کے باب اطاعت میں دیکھئے
اس کا مقام باب اطاعت میں دیکھئے
ہل یستوی الذین کی آیت میں دیکھئے
قرآن کہہ رہا ہے ۔ سراسر کوئی نہیں
دنیا میں عالموں کے برابر کوئی نہیں

اسی طرح ایک اور شاعر علماء کی تعریف کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

عالم کی ذات عالم انسانیت کی جاں

عالم کی ذات جو ہر خلقت کی ترجماں
عالم کی ذات فہم و تفہم کا آسماں
عالم کی ذات حکمت معبود کانشان
حق ساز وحق شناس کو عالم کہا گیا
اسلام کی اساس کو عالم کہا گیا

علماء کی اقسام: علماء کی دو قسمیں ہیں: ایک علمائے حق اور دوسرے علمائے سو ہیں ہر زمانے میں علمائے حق اور علمائے سوء کا ٹکراؤ ہوتا رہا ہے، علمائے سُوء ہمیشہ معاشرے کے خوش حال لوگوں اور حکمرانوں کے ہمنوار ہے اور دین کے مسائل کو ان کے موافق بنا کر پیش کرتے رہے اور علمائے حق ہمیشہ حکمرانوں اور خوش حال لوگوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر دین کا آواز اور صدائے حق بلند کرتے رہے ہیں۔

ایک حدیث مبارکہ میں علمائے سُوء کی کیفیت یوں ذکر کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں بدترین قسم کے لوگ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:« الْعُلَمَاءُ إِذَا فَسَدُوْا » "فسادی علماء(لوگوں کی بدترین قسم میں سے ہیں)۔"(جامع بیان العلم:669/1)

فسادی علماء وہ ہیں جو ملت کے جذبات کا استحصال کرتے رہتے ہیں، ایسے مسائل کو عوام میں اچھال دیتے ہیں جس کی عوام کو حاجت وضرورت نہیں رہتی، بے موقع و بے محل کے فتوے جاری کرتے رہتے ہیں، بیک جنبش قلم کسی کو بھی مجروح کر بیٹھتے ہیں اور اپنی زبان لن ترانی سے ہر غلط کو صحیح ثابت کر دیتے ہیں تا کہ عوام میں ان کی ساکھ اور وقار برقراررہ سکے۔ ہر زمانے میں ایسے علماء رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جنہیں اپنے علم پر بڑا تکبر وغرور ہوتا ہے جو اپنے سے برتر کسی کو نہیں سمجھتے جس کی چاہے پگڑی اچھالتے رہتے ہیں ایک اور حدیث میں ایسے ہی شریر علماء کی نشاندہی اس طرح کروائی گئی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ« شِرَارُ الْعُلَمَاءِ الَّذِيْنَ يَأْتُوْنَ الْأُمَرَاءَ » "شریر قسم کے علماء وہ ہیں جو حکمرانوں اور خوشحال لوگوں کی خوشنودی حاصل کرتے رہتے ہیں۔" (الاجوبۃ المرضیہ:884/2)

علماء کا وقار و دبدبہ: علماء کا مقام ہر زمانے میں بالاتر رہا ہے، حق گو علماء نے بڑے بڑے بادشاہوں کو من مانی سے روکا اور ان کی بہترین رہنمائی کی ہے جس کی چند مثالیں یہاں دی جاتی ہیں:

1۔ پہلی مثال: اموی بادشاہ ہشام ایک دفعہ حج کے لئے آیا اور حرم شریف میں تشریف فرما ہوا اور حکم دیا کہ کسی تابعی کو ڈھونڈ لاؤ، حضرت طاوس بن کیسان رحمہ اللہ کو اس کے سامنے پیش کیا گیا، وہ بادشاہ کے تخت کے ایک کنارے جوتے چھوڑ دئے ، اور بالر است بادشاہ کو اس کے نام سے مخاطب کیا، اور اس کے حق میں امیر المؤمنین کا لقب استعمال نہ کیا، یہ حرکت دیکھ کر ہشام کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں لیکن اس نے بیت اللہ کی حرمت کے پیش نظر غصے کو ضبط کر لیا، لیکن خاموش نہ رہ سکا، دھیمے الفاظ میں پوچھ لیا کہ اے طاوس! تم نے اس طرح کی بے ادبی کیوں کی؟ طاوس نے کہا کہ میں نے کیا کیا؟ اس نے کہا: تم نے میرے تخت کے ایک کنارے جوتے کیوں اتار دیئے ؟ یہ شاہی دربار کے خلاف آداب ہے، حضرت طاوس بن کیسان رحمہ اللہ نے بڑے ہی دھیمے انداز میں کہا کہ "میری بات غور سے سنو! میں روزانہ پانچ وقت اللہ کے دربار میں جوتے اتارتا ہوں اس نے آج تک مجھے نہیں ڈانٹا اور نہ وہ ناراض ہوا۔" پھر کہا کہ میں نے تمہیں امیر المؤمنین کے لقب سے اسی لئے مخاطب نہیں کیا کہ "تمہاری امارت وحکومت واقتدار پر تمام مسلمان متفق نہیں ہیں۔"

اب رہی بات تمہیں نام سے اسی لئے پکارا اور تمہاری کنیت سے بھی نہیں پکارا۔ سنو! اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین انبیاء کو نام لے کر پکارا ہے، یا نوح، یا داؤد، یا یحییٰ، یا موسیٰ، یا عیسیٰ اور اپنے دشمنوں کو کنیت سے پکارا ہے جیسا کہ ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ﴾ سے ظاہر ہے۔ رہی بات میں آپ کی اجازت کے بغیر ہی بیٹھ گیا اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "اگر کسی جہنمی کو دیکھنا چاہیں تو اس شخص کو دیکھ لیں جو خود بیٹھا ہو اور دوسرے لوگ دست بستہ اس کے گرد کھڑے ہوں۔" مجھے ناگوار گزرا کہ آپ وہ شخص ہوں جسے اہل جہنم میں شمار کیا جائے۔" ہشام یہ سن کر شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا اور پھر اس نے سر اٹھایا اور کہا: "آپ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔" طاوس بن کیسان نے فرمایا: "میں نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "جہنم میں لمبے اور موٹے ستونوں کی مانند خوفناک سانپ ہوں گے اور خچروں کی مانند بچھو، جو ہر اس حکمران کو ڈسیں گے جو اپنی رعایا میں انصاف نہیں کرتا، یہ کہہ کر آپ وہاں سے اٹھے اور چلے گئے۔" (حیات تابعین کے درخشاں پہلو:347)

2۔ دوسری مثال: ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت طاوس بن کیسان خلیفہ سلیمان کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اے امیر المؤمنین ، جہنم کے گہرے گڑھے میں کنویں کی مینڈ پر ایک پتھر تھا، وہ اس میں گرا اور ستر سال میں کنویں کی تہہ میں پہنچا۔ اے امیر المؤمنین! کیا تم جانتے ہو جہنم کا یہ ہولناک کنواں اللہ تعالیٰ نے کس کے لئے تیار کر کھا ہے؟ اس نے جواب دیا: مجھے علم نہیں۔ حضرت طاوس بن کیسان رحمہ اللہ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے یہ کنواں اس شخص کے لئے تیار کر رکھا ہے جسے اس نے مسلمانوں کا حکمران بنایا، لیکن اس نے اپنی رعایا پر ظلم و تشدد کیا یہ سن کر خلیفہ

سلیمان پر لرزہ طاری ہو گیا، اور طاؤس بن کیسان اسی حالت میں اسے چھوڑ کر واپس چلے۔"(حیات تابعین کے درخشاں پہلو:343)

3۔ تیسری مثال: حضرت عمر بن عبد العزیز جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حضرت طاؤس بن کیسان کی طرف پیغام بھیجا کہ ازراہِ کرم مجھے کوئی وصیت و نصیحت کیجئے، انہوں نے صرف ایک سطر میں نصیحت لکھ کر بھیج دی کہ "اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے تمام کاموں میں خیر و برکت ہو تو کاروبار حکومت کی ذمہ داریاں نیک لوگوں کے سپرد کیجئے۔"

جب عمر بن عبد العزیز نے یہ نصیحت پڑھی تو پکار اٹھے اور بار بار کہنے لگے کہ "اتنی ہی نصیحت کافی ہے، اتنی ہی نصیحت کافی ہے۔"(حیات تابعین کے درخشاں پہلو: 344)

4۔ چوتھی مثال: ایک وقت کی بات ہے کہ فقیہ مکہ، مفتی اعظم، فقہائے حجاز کے سردار حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ جن کے علم پر صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو بھی ناز تھا، مشہور اموی بادشاہ ہشام بن عبد الملک کے دربار میں ملت اسلامیہ کی ضروریات اور ان کے احوال پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے، اس وقت دربار میں اہم شخصیات جلوہ افروز تھیں لیکن جب ہشام کو پتہ چلا کے حضرت عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ حاضر ہوئے ہیں تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوا اور تعظیماً ان کا استقبال فرمایا اور اپنے تخت پر بازو ہی بٹھالیا۔ اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: بتلاؤ اے ابو محمد! کیسے آنا ہوا؟ عطا بن ابی رباح نے فرمایا: "امیر المؤمنین! حرمین شریفین کے باشندے اللہ جل جلالہ کے مہمان ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے پڑوسی ہیں، میری گزارش ہے کہ ان کے وظائف مقرر کر دیجئے۔" بادشاہ نے فوراً اپنے منشی کو حکم دیا کہ "مکہ و مدینہ کے تمام باشندگان کو سال بھر کے وظائف مقرر کر دیئے جانے کا حکم صادر کر دیں۔"

پھر ہشام بن عبد الملک نے پوچھا: "میرے لائق اور کوئی خدمت؟" عطاء بن ابی رباح نے فرمایا: "اہل حجاز اور اہل عرب اسلام کے سپوت ہیں، میری تجویز یہ ہے کہ ان کے صدقات کا وافر حصہ انہیں پر خرچ کر دیا جائے۔"

یہ سنتے ہی بادشاہ نے کاتب کو اس کی تعمیل کا حکم دیا۔ پھر بادشاہ نے پوچھا کہ "میرے لائق اور کوئی خدمت؟" عطاء بن ابی رباح نے فرمایا: "سرحدوں پر دفاعی خدمات انجام دینے والے مجاہدین ملک کی بڑی اہم خدمات سر انجام دے رہے ہیں، جب بھی کوئی دشمن ملک کی طرف بری نگاہ سے دیکھتا ہے تو یہ اس کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ انہیں بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے، اگر یہ بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تو یاد رکھنا ملک کی سرحدیں غیر محفوظ ہو جائیں گی۔"

یہ سنتے ہی ہشام بن عبد الملک نے وہاں وافر مقدار میں راشن، اناج اور مزید سہولیات بہم پہنچانے کا حکم صادر فرمایا۔ پھر پوچھا: اے ابو محمد! میرے لائق اور کوئی خدمت؟ عطاء بن ابی رباح نے فرمایا: "ہاں امیر المؤمنین! ذمی لوگوں سے ان کی طاقت سے بڑھ کر ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔"

یہ سنتے ہی ہشام نے فوراً حکم صادر کر دیا کہ کسی بھی ذمی سے اس کی طاقت سے بڑھ کر ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔" پھر پوچھا: اے ابو محمد! میرے لائق اور کوئی خدمت؟ عطاء بن ابی رباح نے فرمایا: "ہاں! اپنے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، یاد رکھو تمہیں اکیلا ہی پیدا کیا گیا ہے، تم اکیلے ہی مرو گے اور اکیلے ہی تمہیں قبر سے اٹھایا جائے گا، اللہ کی قسم! کوئی بھی ان درباریوں میں سے تمہارے ساتھ نہ ہو گا۔ یہ سن کر ہشام بن عبد الملک سر جھکائے زار و قطار رونے لگا، اسے روتا ہوا چھوڑ کر عطاء بن ابی رباح وہاں سے اٹھ کر چل پڑے، جب وہ محل کے دروازے پر پہنچے تو ایک آدمی خزانے سے بھری ہوئی تھیلی آپ کے سامنے یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ "اسے قبول کیجئے۔" پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے بھی اس کا علم نہیں لیکن بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں یہ پیش کر رہا ہوں فرمانے لگے، افسوس صد افسوس! میں نے یہ باتیں کوئی ذاتی فائدے اٹھانے کے لئے نہیں کی تھیں اور ساتھ ہی یہ آیت تلاوت کی کہ ﴿ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ "اس پر میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو پروردگار عالم پر ہے۔" یہ کہتے ہوئے تھیلی لینے سے انکار کر دیا اور محل کے باہر چلے گئے وہاں قطرہ پانی تک نہ پیا۔(حیات تابعین کے درخشاں پہلو:27)

"اللہ اکبر و للہ الحمد" یہ تھے وہ علمائے ربانی جو بادشاہوں کی تک نکیر کیا کرتے تھے، ہر زمانے کے علماء کا یہی کردار ہونا چاہئے جس سے ملک و قوم ترقی کی سمت گامزن رہتے ہیں۔

علمائے حق کے خلاف سازشیں: علمائے حق کے خلاف علمائے سو اور عام حاسدین کا ایک ایسا گروہ ہمیشہ ہر زمانے میں قائم رہا جو ہمیشہ سازشیں رچتا رہا اور حکام و امراء کے نزدیک ان کی چغلیاں کھاتا رہا تا کہ ان کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور شکم پروری کا کچھ سامان مہیا ہو جائے اور حق گو علماء کے خلاف حکام و امراء تعزیرات نافذ کرتے رہیں جس کی کئی ایک مثالیں تاریخ میں بیان کی گئی ہیں، یہاں صرف ایک مثال بیان کرنا مناسب ہو گا۔

مشہور تابعی حضرت عامر بن عبد اللہ التمیمی رحمہ اللہ وادی نجد کے ایک معروف خاندان بنو تمیم کے چشم و چراغ تھے، بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا کرتے تھے، ایک ملازم

پولیس نے ان پر الزامات عائد کئے اور ان الزامات سے امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تک پہنچادیئے۔ الزامات یہ تھے:

1۔ مسلمانوں کی جماعت سے خروج کا الزام عائد کیا۔

2۔ دوسرا الزام یہ لگایا کہ انہوں نے نکاح نہ کر کے سنت سے روگردانی کی۔

3۔ تیسرا الزام یہ عائد کیا کہ یہ نہ دودھ پیتے ہیں اور نہ گوشت کھاتے ہیں اس طرح یہ حلال چیزوں کو حرام کرلئے ہیں۔

4۔ چوتھا الزام یہ عائد کیا کہ یہ حکمرانوں کی مجلسوں سے کتراتے ہیں۔

ان الزامات کو پڑھنے کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے گورنر کو تحقیقات کر کے حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا حکم دیا، گورنر نے انہیں طلب کیا اور ان سے ان الزامات پر استفسار کیا تو حضرت عامر بن عبد اللہ رحمہ اللہ ہ نے ہر اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔ گورنر نے سوال کیا کہ کیا آپ سنت سے اعراض کرتے ہوئے نکاح سے انکاری ہیں۔ اس الزام کے جواب میں انہوں نے جواب دیا: بات یہ نہیں ہے کہ میں سنت کا انکار کرتے ہوئے نکاح نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں اس بات کا عقیدہ رکھتا ہوں کہ اسلام میں رہبانیت و ترک دنیا جائز نہیں ہے لیکن میرے پاس صرف ایک ہی دل ہے جو اللہ سے لو لگایا ہوا ہے، مجھے یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ نکاح کرنے سے بیوی میرے دل پر غالب نہ آجائے۔"

گورنر نے دوسرا سوال پوچھا کہ تم گوشت اور دودھ سے بنی اشیاء کیوں نہیں کھاتے پیتے؟ انہوں نے جواباً عرض کیا کہ بات یہ نہیں ہے کہ میں گوشت نہیں کھاتا اور دودھ نہیں پیتا اور دودھ سے بنی اشیاء کا استعمال نہیں کرتا۔ سچائی یہ ہے کہ جب آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے تو کھالیتا ہوں، رہی دودھ سے بنی اشیاء پنیر وغیر تو معاملہ یہ ہے کہ میں نے جہاں سکونت اختیار کی ہے، اس کے اطراف واکناف میں آتش پرست (مجوسی) آباد ہیں، اور وہ دودھ کی اشیاء پنیر وغیرہ بناتے ہیں، یہ قوم مردار اور مذبوحہ جانوروں میں فرق نہیں کرتی، مجھے خدشہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں یہ لوگ مردہ جانوروں کی اشیاء کا استعمال کرتے ہوں گے۔ اگر کوئی مسلمان تصدیق کرے کہ تمام اجزاء حلال استعمال ہوتے ہیں تو میں بخوشی کھا لیتا ہوں۔

گورنر نے پوچھا کہ تم حکمرانوں کی مجلسوں سے کیوں کتراتے ہو اور ان کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتے؟ انہوں نے فرمایا: "تمہارے دروازے پر ضرورت مند آتے ہیں، انہیں اپنے پاس بلاؤ، اور ان کی ضروریات پوری کرو، اور جس کو تم سے کوئی غرض نہیں، اس کے پیچھے کیوں لگتے ہو، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔

ان الزامات کی سنگینی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عامر بن عبد اللہ کے حامیوں اور مخالفین دو گروہوں میں منقسم ہو گئے قریب تھا کہ کوئی اندوہناک فتنہ سرزد نہ ہو جائے، جب گورنر نے تحقیقات کی تکمیل کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تحقیقاتی رپورٹ روانہ کر دی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں ملک شام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا اور کہا کہ انہیں رہائش فراہم کریں اور ان کی عزت و تکریم کریں۔ جب حضرت عامر بن عبد اللہ رحمہ اللہ اپنی ہجرت شروع کی تو اللہ سے دعا کی کہ

"اے اللہ! جس کسی نے مجھ پر الزام لگائے اور مجھے بدنام کرنے کے لئے کوشاں رہا، جو مجھے میرے شہر سے نکالنے کا سبب بنا، میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جدائی کا باعث بنا، اے اللہ! میں نے اسے معاف کیا، تو بھی معاف کر دے اور اے اللہ! دین و دنیا میں عافیت عطا کرنا، مجھے اور تمام مسلمان کو اپنی رحمت، احسان اور معافی کی چادر میں ڈھانپ لے، بلاشبہ تو بہت رحم کرنے والا ہے۔" (حیات تابعین کے درخشاں پہلو:45۔46)

مسائل کے لیے علمائے حق سے رجوع کریں :

ہر مسلمان کو چاہئے کہ دین کے مسائل علمائے کرام سے سیکھیں اور ان ہی سے دین کا علم حاصل کریں کسی بھی غیر عالم سے نہ دین کا مسئلہ پوچھیں اور نہ ان سے دین کا علم حاصل کریں، ورنہ گمراہی عام ہو جائیگی۔ علماء کی نظر، بدعات و خرافات اور گمراہیوں پر ہر وقت لگی رہتی ہے، علماء پر فریضہ بھی ہے کہ وہ حالات پر گہری نظر رکھیں، جیسا کہ صوم عاشوراء کو لوگوں نے لازم سمجھ رکھا تھا، لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے خوبصورت انداز میں لوگوں کو سمجھایا حضرت حمید بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں خطبہ دیا اور کہا:

«يَا أَهْلَ المَدِينَةِ، أَينَ عُلَمَاؤُكُمْ؟ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلّمَ ، يَقُوْلُ : هَذَا يَوْمُ عَاشُوْرَاءَ ، وَلَمْ يَكْتُبْ اللهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهُ، وَأَنَا صَائِمٌ، فَمَنْ شَاءَ فَلْيَصُمْ، وَمَنْ شَاءَ فَلْيُفْطِر»

"مدینہ والو! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے تو رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ یہ یوم عاشوراء ہے، اس دن کا روزہ ہم پر فرض نہیں کیا گیا، البتہ میں روزہ سے ہوں، اس لئے تم میں سے جو آدمی اس دن روزہ رکھنا چاہتا ہو، وہ رکھ لے۔" (صحیح بخاری 2003؛ مسند احمد:3925)

اسی طرح عورتوں میں نقلی بالوں کے استعمال کا رواج عام ہو گیا تھا، جب یہ خبر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے ان الفاظ میں لوگوں کی رہنمائی فرمائی۔ حضرت حمید بن عبد الرحمن روایت

کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا، جبکہ ان کے ہاتھ میں بالوں کا ایک گچھا تھا، انہوں نے کہا: يَا أَهْلَ المَدِينَةِ أَيْنَ عُلَمَاؤُكُمْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَى عَنْ مِثْلِ هذِهِ، وَيَقُولُ : إِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُوإِسْرَائِيلَ حِيْنَ اتَّخَذَهَا نِسَاؤُهُم

"اے مدینہ والو! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ اس سے منع فرماتے تھے، نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

"بنو اسرائیل کو اس وقت عذاب دیا گیا جس وقت ان کی عورتوں نے اس قسم کے بالوں کے گچھے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔" (صحیح بخاری:3468، 5932)

علماء خدا نہیں: علماء دین کے رہبر اور قوم وملت کے رہنما ہیں، وہ نبیوں کے خلیفہ اور ان کے علم کے وارث ہیں، علماء خدا نہیں ہوتے یا علماء کو اپنی جانب سے حلال و حرام قرار دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، بنی اسرائیل کی گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے علماء کو اتنا بااختیار بنا رکھا تھا کہ علماء نے جس چیز کو حلال کیا اس کو حلال سمجھنے لگے اور جس چیز کو انہوں نے حرام قرار دیا اس کو حرام سمجھنے لگے، حالانکہ حلال وہ ہے جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میری گردن میں سونے کی ایک صلیب تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اے عدی! اس بُت کو پھینک دو، اور میں نے آپ کو سورہ برات کی آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا:

﴿اتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ "انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنالیا۔" (سورۃ التوبہ:31)

میں نے کہا: ہم ان کی عبادت نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا: «أَمَا إِنَّهُمْ لَمْ يَكُونُوا يَعْبُدُونَهُمْ وَلَكِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا أَحَلُّوْا لَهُمْ شَيْئًا إِسْتَحَلُّوْا وَإِذَا حَرَّمُوْا عَلَيْهِمْ شَيْئًا حَرَّمُوْهُ ؟ فَتِلْكَ عِبَادَتُهُمْ» "ایسا نہیں کہ وہ ان کی عبادت کرتے ہوں، بلکہ معاملہ اس طرح تھا کہ جب وہ کسی چیز کو حلال کرتے تو وہ لوگ بھی اسے حلال سمجھنے لگے اور جب ان پر کسی چیز کو حرام کرتے تو وہ بھی اسے حرام سمجھتے (یہ ان کی عبادت ہے)۔" (سلسلہ صحیحہ:965)

اپنے علماء کی عظمت کے لئے یہودی و نصاری انہیں سجدہ کیا کرتے تھے، گویا انہوں نے علماء کو رب اور معبود تصور کر رکھا تھا، یہی عادت مشرکین میں بھی پائی جاتی ہے جو اپنے پنڈتوں کو سجدہ کرتے ہیں جس کے سبب وہ گمراہ ہوئے اور اللہ کا غصہ ان پر نازل ہوتا رہا اور وہ اللہ کی ناراضگی کا موجب بنے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: يَارَسُوْلَ اللهِ ، أَرَأَيْتَ أَهْلَ الْكِتَابِ يَسْجُدُونَ الأَسَاقِفَتِهِمْ وَبَطَارِقَتِهِمْ ؟ أَفَلَا نَسْجُدُ لَكَ؟ قَالَ: لَوْ كُنْتُ آمِراً أَحَداً أَنْ يَسْجُدَ لأَحَدٍ لأَمَرْتُ المَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا، وَلَا تُؤَدّى المَرْأَةُ حَقَّ زَوْجِهَا حَتّٰى لَوْ سَأَلَهَا نَفْسَهَا عَلَى قَتَبٍ لَا عْطَتْهُ

"اے اللہ کے رسول! اہل کتاب اپنے علماء اور پادریوں کو سجدہ کرتے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم آپ کو سجدہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، بیوی اپنے شوہر کا حق ادا نہیں کر سکتی حتی کہ اگر شوہر اس سے ملاپ کا مطالبہ کرے اور وہ اونٹ کے پالان پر ہو اور وہ اس کی خواہش پوری کر دے تب بھی۔" (سلسلہ صحیحہ:1971)

یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ قیامت سے پہلے اللہ سبحانہ وتعالیٰ حق گو علمائے ربانی کو دنیا سے اٹھالے گا جس کے سبب دین کا فہم و فراست کم ہو جائے گا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنّ اللهَ لَا يَقْبِضُ العِلْمَ انْتِزَاعَا يَنْتَزِعُهُ مِنَ العِبَادِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ العِلْمَ بِقَبْضِ العُلَمَاءِ، حَتّى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِماً اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤساً جُهّالا، فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَ أَضَلُّوْا» "بے شک اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ وہ اس کو لوگوں سے سلب کر لے، وہ تو علماء کو فوت کر کے علم کو اٹھالے گا، یہاں تک کہ جب وہ کسی عالم کو زندہ نہیں چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے، پس جب ان سے سوال کیا جائیگا وہ بغیر علم کے فتوی دیں گے اور اس طرح خود بھی گمراہ جائیں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔" (مسند احمد: 6511، 6896؛ صحیح بخاری:100)

علمائے ربانی کی تکریم واحترام: علمائے حق کی توقیر و تکریم ہمیشہ ہونی چاہئے حق گو علمائے ربانی کی قدر و قیمت کا اندازہ ان دو واقعات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جن کی قدر و منزلت کو خلفائے راشدین نے بھی تسلیم کیا تھا واقعہ یوں کہ حضرت شریح القاضی ایک عظیم تابعی گزرے ہیں، جنھوں نے مسلسل ساٹھ سال تک قاضی کی حیثیت سے قابل قدر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا ہے، اور حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت امیر معاویہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے اپنے عہد خلافت میں انہیں ان کے

اسی عہدے پر سرفراز رکھا جو حق کے علمبردار اور سچائی کے پیکر اور انتہائی بے خوف وںڈر تھے۔

ایک وقت کی بات ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک بدوی سے گھوڑی خریدی اور اسے قیمت ادا کر دی، اس پر سوار ہوئے اور چل دیئے، ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ وہ لنگڑانے لگی، آپ واپس لوٹ آئے اور اس شخص سے کہا: یہ گھوڑی واپس لے لو کیونکہ یہ لنگڑاتی ہے اس بدوی نے کہا: امیر المؤمنین واپس نہیں لوں گا کیونکہ میں نے صحیح حالت میں آپ سے سودا کیا ہے۔ امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ چلو کسی کو منصف مقرر کرلیں اور فیصلہ کروالیں، اس بدوی نے کہا کہ "کیا آپ کو شریح بن حارث کندی کا فیصلہ منظور ہوگا؟" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے منظور ہے۔ دونوں ان کے پاس پہنچے، انہوں نے بدوی کی بات پورے اطمینان سے سنی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: "اے امیر المؤمنین! کیا یہ گھوڑی جس وقت آپ نے خریدی تھی، صحیح سالم و تندرست و صحتمند تھی؟ فرمایا: "ہاں" قاضی شریح نے کہا: امیر المؤمنین! جو چیز آپ نے درست حالت میں خریدی تھی اسے اپنے پاس رکھئے یا پھر اسی درست حالت میں واپس کر دیجئے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح رحمہ اللہ کی جانب تعجب سے دیکھتے رہے اور کہا: کیا یہ فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہے؟ انہوں نے کہا: حق وانصاف اور عدل کا تقاضا یہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "آپ کے فیصلے سے دلی مسرت ہوئی اب آپ کوفہ تشریف لے جائیں آج سے آپ وہاں کے رئیس القضاۃ مقرر کر دیئے گئے ہیں، بلاشبہ آپ جیسا نڈر اور باصلاحیت شخص اسی منصب کا حقدار ہے۔ (حیات تابعین کے درخشاں پہلو: 138-139)

ایک اور واقعہ یوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ دوران سفر کہیں گم ہوگئی اور وہ ایک ذمی کے ہاتھ ملی۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب یہ زرہ اس ذمی کے ہاتھ میں دیکھی تو اس سے کہا کہ یہ زرہ میری ہے، کیونکہ نہ میں نے اسے فروخت کیا ہے اور نہ کسی کو تحفتاً دیا ہے۔ اس ذمی نے کہا کہ یہ زرہ اس وقت میری ہے کیونکہ یہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس ذمی نے کہا کہ قاضی کے پاس چلئے وہ جو فیصلہ کرے گا منظور ہے۔ دونوں حضرات قاضی شریح کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مدعی پیش کیا۔ قاضی شریح نے پہلے ذمی سے اس زرہ کے بارے میں استفسار کیا: اس ذمی نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے کیونکہ وہ میرے قبضے میں ہے۔ حضرت قاضی شریح نے حضرت علی سے کہا کہ "امیر المؤمنین مجھے یقین ہے کہ یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ لیکن حق ملکیت ثابت کرنے کے لئے دو گواہ چاہیئے۔" (حیات تابعین کے درخشاں پہلو: 142-143)

علمائے حق کی حق گوئی وصداقت پر مبنی اور بھی واقعات مذکور ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ موجودہ دور کے علمائے کرام اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور امت میں اپنے وقار کو قائم رکھیں، اور امت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو دریا پار کروائیں۔ اس وقت علماء کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق وسعادت نصیب فرمائے۔ آمین

☆☆☆

قیام کیلئے غسل کرنا، مسواک کرنا، خوبصورت لباس پہننا، بہترین خوشبو استعال کرنا

1- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک برتن تھا جس میں آپ کی مسواک رکھی جاتی، جب آپ رات کو قیام کیلئے اٹھتے، استنجا کرتے، مسواک کرتے، وضو کرتے، اور پھر اپنی ازواج کے گھروں میں سے خوشبو تلاش کرتے اور لگاتے

2- عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ انکو پسند تھا کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوں تو اچھے، صاف ستھرے کپڑے پہنیں اور خوشبو لگائیں۔

3۔ حضرت تمیم داری رحمہ اللہ جب رات کو تہجد کے لیے کھڑے ہوتے تو عمدہ بہترین خوشبو لگاتے اور ایک ہزار (درہم) کی قیمت کا جوڑا خرید ارکھا تھا جو قیام کے وقت زیب تن کرتے۔

4۔ حضرت ابنِ محیریز رحمہ اللہ جب رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو بہت قیمتی خوشبو منگواتے اور اسے بہت زیادہ لگاتے جس سے انکے کپڑے بہت زیادہ معطر ہو جاتے۔

5۔ مغیرہ بن حکیم صنعانی رحمہ اللہ جب تہجد کے لیے اٹھتے تو بہترین کپڑے پہنتے اور اپنے گھر والوں سے خوشبو لیکر لگاتے۔ (انکا ایک اور وصف بیان ہوا کہ) وہ تہجد گزاروں میں سے تھے۔

6۔ عمرو بن الاسود رحمہ اللہ نے اسی (80) دینار کا ایک (بشت) حلہ خریدا اور اسے ایک دینار میں رنگوایا، وہ اسے سارا دن سنبھال کر لپیٹے رکھتے اور رات اسی میں قیام کرتے۔

7- امام مجاہد بن جبر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وہ لوگ رات کے وقت لہسن، اور پیاز وغیرہ کھانا اچھا نہیں سمجھتے تھے، اور انہیں پسند تھا کہ آدمی جب رات کو قیام کرے تو خوشبو لگائے، اور وہ خوشبو اپنی داڑھی مونچھوں کو بھی لگائے۔

8۔ عبد اللہ بن زکریا رحمہ اللہ کے متعلق آتا ھے کہ وہ اور انکے تمام ساتھی عشاء کے بعد جب قیام کا ارادہ کرتے تو روزانہ غسل فرماتے۔

(مختصر قيام الليل وقيام رمضان لمحمد بن نصر المروزي 112؛ عبد الرحمن السعيدي)



کرامات صحابہ واولیاء

ایک نومسلم بانکے رام کی دوسری بڑی کرامت!

ڈاکٹر عبدالرب ثاقب ڈڈلی (قسط 25)

ایک نومسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ولی اور محدث بنالیا!

محترم قارئین کرام! آپ نے یہ مضمون اچھی طرح پڑھ لیا ہو گا۔ جو صراط مستقیم کے شمارہ ماہ فروری اور مارچ 2026ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ اس میں حضرت ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کی ایک ایسی تحقیق پیش کی گئی ہے، جو ڈیڑھ ہزار سالہ اسلامی تاریخ میں کسی نے بھی نہیں کی، وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی نے دیکھا کہ قرآن حکیم ہمارے پاس ہر طرح سے ایک جلد میں محفوظ ہے، لیکن احادیث رسول ﷺ ایک جگہ محفوظ نہیں ہیں، بلکہ وہ تقریباً دو سو حدیث کی کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں اور احادیث کی مکمل کتب تک رسائی ہر ایک کی بس میں نہیں ہے۔ ہماری رسائی صحاح ستہ اور چند احادیث کی معروف کتب تک محدود ہے۔ دنیا میں موجود پوری کتب حدیث تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر ضیا الرحمن اعظمی عمری مدنی سعودی (اللہ تبارک و تعالیٰ نے ڈاکٹر اعظمی کو سعودی نیشنلٹی عطا فرمائی تھی) نے دنیا میں موجود تمام کتب احادیث کو جمع کیا اور ان کی تمام احادیث پر تحقیق کی اور جو احادیث صحیح اور مرفوع تھیں ان کو اپنی کتاب میں جمع کیا اور اپنی اس کتاب کا نام 'الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل' رکھا، جس میں کل 16 ہزار 5 سو 46 (16546) احادیث کو جمع کیا اور ان پر تحقیق کی، چونکہ وہ چالیس سال تک حدیث کے استاذ تھے، انہوں نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ کل کتب احادیث کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔ مگر 165 کتب تک ڈاکٹر اعظمی کی رسائی ہو سکی۔ بقیہ 5 فیصد احادیث ہوں گی جو ان سے چھوٹ گئی ہوں گی۔ چونکہ وہ ایک عرصہ تک الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ میں حدیث کے استاذ تھے اور دو مرتبہ کلیۃ الحدیث کے ڈین بھی رہے، اس لئے حدیث کی تخریج میں اللہ کریم نے انہیں ید طولیٰ عطا فرمایا تھا، اس لیے وہ کام خود انجام دیئے۔ دوسروں کی تحقیق پر اپنی تحقیق کا انحصار نہیں کیا، حتی کہ اپنے استاد گرامی علامہ البانی کی تحقیق کو بھی انہوں نے اپنے انتخاب کی بنیاد نہیں بنایا، کیونکہ اپنی تحقیق ہو تو اس کی صحت اور سقم کا مرجع ڈاکٹر اعظمی ہوں گے، نہ کہ استاذ گرامی علامہ الشیخ ناصر الدین البانی۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اس سے پہلے کی قسط میں ڈاکٹر اعظمی کی کتاب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر تھی کہ اس پر ایسی تحقیق کسی نے بھی نہیں کی تھی، بلکہ ان کے استاذ علامہ البانی نے بھی نہیں کی تھی۔

بلکہ ان کے استاذ محترم علامہ البانی اپنے شاگرد کو صاحب ابوہریرہؓ سے یاد کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں 'اللہ کے ولی' کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔

اب اس مضمون میں ان کا وہ کارنامہ بیان کیا گیا ہے، جو اس کارنامہ سے بڑا کارنامہ ہے۔ اللہ نے اُن سے وہ کام لیا جو اسلامی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں کسی سے نہیں لیا، جو انڈیا کے صوبہ اتر پردیش (U.P) کے ایک نومسلم بانکے رام سے لیا، جس پر دنیا رشک کناں ہے۔ ان کا یہ کارنامہ پہلے کارنامہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ انہوں نے اللہ حی و قیوم سے اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے دس سال کی عمر مانگی تھی مگر اللہ نے انہیں 20 سال عطا کئے، اس لیے کہ یہ کام دس سال میں نہیں بلکہ بیس سال میں تکمیل کو پہنچا اور ڈاکٹر اعظمی صاحب نے اسی کتاب کا اختصار بھی کر دیا جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی مکمل 19 جلدیں تیار ہو گئیں، اس اعتبار سے بھی یہ اللہ کے ولی قرار پائے۔

﴿ذَٰلِكَ فَضۡلُ ٱللَّهِ يُؤۡتِيهِ مَن يَشَآءُ﴾

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اور اس پروجیکٹ پر مضمون لکھنے والے نوجوان عالم دین مولانا حافظ عبد الحسیب عمری مدنی استاذ جامعہ محمدیہ بنگلور جو شہر حیدر آباد دکن کے معروف تاجر اور اہل علم کے قدرداں بارکس کے شیخ عبود حفظہ اللہ کے لائق وفائق داماد ہیں، ان کی قابلیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اللہ کے ولی ڈاکٹر اعظمی نے 2019ء میں مولانا عبد الحسیب عمری مدنی کو الجامع الکامل عطا فرمایا، بلکہ اعظمی صاحب سے اللہ کے نبی ﷺ تک اس مجموعہ الجامع الکامل فی الحدیث الشامل کی تمام احادیث کو روایت کرنے کی اجازت بھی عطا فرمائی اور کسی بھی زبان میں اس کے ترجمہ و تلخیص کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔ چنانچہ آپ کے معاون مولانا حافظ عبد الحسیب عمری مدنی نے اس کے خلاصہ کا اُردو ترجمہ اپنے اشراف میں مکمل کر لیا ہے اور انگریزی کا کام برطانیہ میں مکمل ہو چکا ہے۔ ان شاء اللہ اپنے وقت پر یہ تراجم منظر عام پر آئیں گے، جس سے دنیا استفادہ کرے گی۔ ان شاء اللہ

یہاں ایک ضروری بات کی طرف اشارہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ اس نئی اور کم یاب کتاب کو ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کے نام سے تلاش کریں گے تو نہیں ملے گی بلکہ یہ نئی کتاب جو 19 جلدوں پر مشتمل ہے، اس پر ان کا نام ابو احمد محمد عبداللہ درج ہے۔

کیونکہ میرے خیال میں ضیاء الرحمٰن سے عجمیت کا رنگ جھلک رہا ہے، اس لیے اپنے بڑے فرزند احمد کی مناسبت سے کنیت 'ابو احمد' رکھی اور اپنا نام محمد عبداللہ رکھا، اس کے لئے شاید مصنف نے کسی کے مشورہ سے اپنا نام تبدیل کر لیا ہو گا۔ اس لئے اس کا خیال رکھیں، اس دوسری اور اہم ترین کتاب کو پیش کرنے

کا مقصد یہی ہے کہ اس کتاب سے بھی ولایت چھلکتی ہے اور آپ کے ولی ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک باقی نہیں رہتا ہے، اس لئے اس کتاب کو سمجھنے کے لئے مولانا حافظ عبد الحسیب عمری مدنی صاحب کا یہ مضمون پیش کیا گیا ہے جو 'راہ حق کا مسافر' نامی کتاب ڈاکٹر ضیاء الرحمن اعظمی عمری رحمہ اللہ کی وفات پر ستمبر 2020 میں جامعہ دار السلام عمر آباد سے شائع ہوئی ہے، اس میں یہ مضمون موجود ہے۔

واضح ہو کہ ان دو کارناموں کے علاوہ ڈاکٹر اعظمی صاحب کے اور بھی بہت سے کارنامے ہیں لیکن ہم ان دو پر ہی اکتفا کرتے ہیں، ویسے جامعہ دار السلام عمر آباد کے فارغین میں یہ ایک عبقری عمری ہیں۔

اللّٰهُمَّ اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه و أكرم نزله ... آمین

☆☆☆

ماہِ رمضان کے چھوٹے ہوئے روزے کی قضا کو شوال کے روزے پر مقدم کیا جائے یا پھر پہلے شوال کے روزے رکھے جائیں؟

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ» (صحیح مسلم: 1164) "جو ماہ رمضان کا روزہ رکھے پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے اسے پوری زندگی روزہ رکھنے کا ثواب ملے گا۔"

قارئین کرام: شریعت نے شوال کے روزے کی فضیلت کو ماہ رمضان کے روزے سے جوڑا ہے وہ بایں طور کہ ماہ رمضان کے بعد ان چھ روزوں کے رکھنے سے پورے سال روزہ رکھنے کا ثواب ملتا ہے، اس فضیلت کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب ماہ رمضان کے روزے کی تکمیل کے بعد شوال کے روزے رکھے جائیں، کیوں کہ ماہ رمضان کے روزے دس مہینے کے روزے کے برابر ہیں، اور شوال کے چھ روزے دو مہینے کے برابر ہوئے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ فَشَهْرٌ بِعَشَرَةِ أَشْهُرٍ، وَصِيَامُ سِتَّةِ أَيَّامٍ بَعْدَ الفِطْرِ فَذَلِكَ تَمَامُ صِيَامِ السَّنَةِ» (مسند أحمد: 22412؛ صحیح الترغیب: 1007) "جو ماہ رمضان کا روزہ رکھے تو ایک مہینہ دس ماہ کے برابر ہوتا ہے، اور عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے (دو ماہ کے برابر ہوتے ہیں) اس طرح سے پورے ایک سال مکمل ہو جاتے ہیں۔" اگر کسی کے ماہ رمضان کے بعض روزے فوت ہو جاتے ہیں تو گویا کہ ان کا ماہ رمضان دس مہینے کے برابر نہیں ہوا چنانچہ جب تک وہ چھوٹے ہوئے روزوں کو مکمل نہ کرلیں اس وقت تک شوال کے روزے کی فضیلت ممکن نہیں۔

اور یہ بات بھی جاننا بہت اہم ہے کہ انسان سے فرائض کے بارے میں باز پرس ہوگی نوافل کے بارے میں نہیں، اس لئے اللہ رب العالمین کا حق پہلے ادا کیا جانا چاہئے پھر اس کے بعد نوافل وغیرہ کا اہتمام ہونا چاہئے، حدیث قدسی میں اللہ رب العالمین فرماتا ہے کہ «وما تقرب إلي عبدي بشيء أحب إلي مما افترضته عليه» (صحیح بخاری: 6137) "جن چیزوں کے ذریعہ بندہ میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں سب سے زیادہ محبوب شی میرے نزدیک فرائض ہیں۔" اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ فرائض نوافل پر مقدم ہیں، اور جس قدر جلدی ہو پہلے فرائض کی ادائیگی کرنی چاہیے۔

اس سلسلے میں سلف صالحین کی رائے بھی یہی ہے کہ پہلے فرض روزوں کی قضا کی جائے پھر نوافل کا اہتمام کیا جائے، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ میرے ذمے رمضان کے کچھ روزے باقی ہیں اور میں عشرہ ذی الحجہ کے روزے رکھنا چاہتا ہوں (کیا ایسا کرنا میرے لئے درست ہے؟)، تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: نہیں، بلکہ پہلے اللہ کا حق ادا کرو یعنی ماہ رمضان میں چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کرو پھر اس کے بعد جتنے نفلی روزے رکھنا چاہو رکھو۔ (سنن الکبری للبیہقی: 8178)

اسی طرح سعید بن جبیر اور عطاء بن ابی رباح رحمہا اللہ کا بھی فتوی موجود ہے کہ پہلے فرض روزے کی قضا کی جائے پھر نفلی روزے رکھے جائیں۔ (مصنف عبد الرزاق: 7713؛ مصنف عبد الرزاق: 7716)

قارئین کرام: مذکورہ آثار سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سلف کرام فرض روزے کی قضا کو نفلی روزے پر مقدم سمجھتے تھے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتوی گذرا جس میں انہوں نے پہلے فرض روزے کی قضا کا حکم دیا اور بعد میں نوافل کا اہتمام کرنے کیلئے کہا، یہاں پر غور کرنے کا مقام ہے کہ عشرہ ذی الحجہ کے روزوں کا ماہ رمضان کے روزے سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے، پھر بھی سلف نے پہلے فرض روزوں کی قضا کا حکم دیا تو پھر شوال کے روزے کا تو ماہ رمضان سے براہ راست تعلق ہے، اور شوال کے چھ روزوں کا ثواب ماہ رمضان کے روزوں کی تکمیل پر ہی منحصر ہے تو یہاں نفلی روزے کو فرض روزے پر مقدم کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی یہ کہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کو تو ماہ شعبان میں قضا کرتی تھیں، جس پتا چلتا ہے کہ چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا میں تاخیر کی جا سکتی ہے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ وہ رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کو تاخیر سے ماہ شعبان میں رکھا کرتی تھیں، لیکن انہوں نے اس کی وجہ بھی بتائی کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ کر نہیں رکھ پاتی تھیں، البتہ ان کے اس عمل سے یہ استدلال کرنا بالکل درست نہیں کہ وہ نفلی روزے کو رمضان کی قضا پر مقدم کرتی تھیں اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ نوافل روزے رکھتی رہی ہوں اور رمضان کی قضا کو مؤخر کرتی رہی ہوں کیوں کہ ایسی کوئی دلیل ان کے متعلق نہیں ملتی، جبکہ اس کے برعکس بعض صحابی کا اور تابعین کا موقف ہے کہ فرض کی ادائیگی نوافل سے پہلے کی جائے۔

اس لئے کم از کم احتیاط کا یہی تقاضا ہے کہ پہلے رمضان المبارک میں چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کی جائے، اور پھر شوال کے چھ روزے رکھے جائیں۔



مسئله ثا لثه:

التزام بعضے مبا حا ت شر عیه محض بنا بر تقلید آ باء و اجداد و بنا برموا فقه اقران و اخوان بدون ظن حصول منفعتے از منا فع ا خر و یه و یا غرضے از اغرا ض دنیو یه ہمه از قبیل بدعات حکمیه است به نسبت اکثر اہل زمان۔اما به نسبت بعضے از ایشا ں پس از قبیل شرک و به نسبت بعضے از ایشاں پس از قبیل بدعت حقیقیه و به نسبت بعضے از قبیل امور معا شیه و به نسبت بعضے از امور لهو یه۔ تفصیل این اجما ل آ نکه چنا نکه ہر چند شارع جل جلا له بعضے احکام شرعیه را بنا بر رعا یت بعضے مصالح معا شیه یا معا دیه مقرر فر موده است مثل تعیین صلوة برائے تو جه الی اللہ و ر خص مسا فر برا ئے دفع مشقت و عدة برا ئے استبراء ر حم و امثال آن اما عباد را با ید که قطع نظر ازمصا لح کر ده در محا فظة نفس صورة ا حکا م شر عیه سعی بلیغ نما یند و بنا برظن حصو ل مصلحت مر عیه در غیر سور معینه یا کمل و جه ہر گز در اقا مت صورة مذ کوره مدا ہنت نه نما یند و تبدیل و تغیر را در آ ں راه ند ہند مثلاً در محافظة صورة نماز اگر چه عا طل از معنی حضور باشد سعی بلیغ با ید کر د و مرا قبه معیتِ ذا تیه را اگر چه سرا سر پر از معنی حذر باشد در عو ض او استعمال نبا ید کرد و در سفر بے مشقت اعرا ض از ر خص شر عیه (نسخه اشرفیه میں ا غرا ض از رقص شر عیه ، ہے ۔ بہاء) نبا ید کر د و در صنا ئع شا قه مثل حدا وة وامثال آں که بمرا تب اشق از سفر باشد رخصتے مذ کور را استعمال نبا ید نمود و بر تقدیر یقین بخلو ر حم از علوق عد ت نبا ید گذا شت۔ بالجمله صور ا حکا م شر عیه درباب اطاعت شا رع قطع نظر از مصا لح مر عیه خود مقصو د لذا تہا گر دیده ہم چنیں بعضے از عقلاء تجر به کار بعضے از اشیاء مبا حه را بنا بر بعضے مصا لح معا شیه تر ویج مے نما یند پس کسا نیکه طا لب مصالح مذ کوره می باشند صورة مر و جه را اقرب طر ق حصول مصالح مذ کوره دا نسته بعمل مے آ رند آ خر شد ه شده در عوام الناس دائر و سائر مے گردد و مصلحت مذ کوره در اکثر ناس رو با ختفا می آ رد و صورة مر و جه مسلّم خوا ص و عوا م میشود و اکثر اشخاص در محا فظت نفس آ نصورة مر و جه قطع نظر بر اشتما ل او بر مصلحت مذ کوره جد و جہد بلیغ مینما یند چنا نچه اگر مصلحت مذ کوره از صورة مسطوره مفقو د گر دد بلکه در التزا م آ ں لحو ق انوا ع مضرا ت بنظر آ ید ہر گز آ نرا از دست ند ہند و ہم چنیں اگر برا ئے حصو ل مصلحت مذ کوره طر یقے دیگر غیر صورت مر و جه میسر الحصو ل با شد ہر گز تبد یل آں روا ندا رند و تا رک صورة مذ کوره در میا ن ایشا ں آ ن قدر مطعو ن و ملام گر دد که تا ر ک اصل مصلحت آن مطعو ن و ملام نگر دد ۔ پس در یں ہنگام آ ں صورت مر وجه را رسم میگویند مثلاً عقلاء سلف بنا بر ایصال ثواب صدقا ت بسو ئے اموات اطعا م طعام مقرر کر ده بو دند و از بسکه محتا جین اقر باء در با ب مصا رف مطلق صدقا ت مقد م اند بر غیر اقر باء بنا بر آ ن محتا جین اقر باء را تقد م میکر دند و ایں امر شده شده دریں زمان بحدی رسیده که در با ب تقسیم طعام سیو م و چهلم و اعرا س در بیان اقرباء معنی تصدق عن المیت و قضاء حاجت محتا جین اصلاً ملحو ظ نیست حتی که اگر لفظ تصدق عن المیت و قضاء حا جت محتا جین بر زبان را نند اغلب که اکثر اقر باء اہل عز ت طعا م مذ کوره را قبو ل نما یند بلکه آ نرا بمشابه سبّ و شتم درحق خود تصور کنند و تقسیم طعام بحدی مسلّم خاص و عام گر دیده که اگر شخصے انوا ع صدقا ت برا ئے اموا ت خود نما ید اما تقسیم طعا م بطر یق مر و ج بعمل نیا رد بحدی مطعو ن و ملام گر دد و اگر گا ہے تصدق برائے ایشاں بعمل نیا رد لیکن تقسیم مذکور بطر یق مر و ج نما ید ہر گز نو ع ے از طعن و ملا مت بسو ئے او عائد نگر دد پس تقسیم طعا م مذ کور دریں زمان از قسم رسو م است نه از قسم عبادات پس کسیکه آ نرا از قسم رسو م دا نسته بعمل مے آ رد در حق او از قسم بدعا ت حکمیه است و کسیکه آنرا مو جب ثواب اموا ت دا نسته بعمل مے آ رد در حق او از قسم بدعات حقیقیه است و کسیکه آنرا با عث توجه اروا ح اموا ت و جا لب ر ضا ئے ایشا ں دا نسته بعمل مے آرد و باز توجه اروا ح ایشا نرا سبب قضا ئے حوا ئج خود و علت حصو ل مقا صد خود میدا ند ہم چنیں تر ک رسوم مذکوره را مو ر ث طرد و لعن ایشاں فهمیده و آ نرا مو جب نکبت و بال و علت بر ہمی مقا صد خود و پر یشا نی مطا لب خود دا نسته ازاں اجتنا ب در زد در حق او از قسم شر ک است و کسیکه بنا بر حا صل کر دن معرفت و روشنا سی در سر کار امیر ے از امراء بطر یق اہدا ئے طعا م مذ کوره بتقریب

سیو م و چہلم بعمل ے آ رد در حق
او از قسم امور معا شیه است و
کسیکه محض بنا بر اجتما ع احبا ب
بحسب اتفاق در بعض اوقا ت تقریبا
ت مذ کورہ را برو ئے کار ے آرد در حق
او از قسم لہو ست پس اگر مبلغ خطیر
در آ نصرف کند در حد اسرا ف دا خل
خوا ہد گر دید با لجملہ معنی رسم
ہمیں است کہ امرے محد ث از
مباحات شر عیه در میا ن اکثر طوا ئف
انا م عوا م بطر یق التزا م مر و ج بحد
ے شدہ باشد کہ تا رک آن امر درمیان
اکثر ایشا ن مطعون و ملام گر دد و تعا
مل در آ ن امر در میا ن اکثر نا س بنا بر
مجر د تقلید اسلا ف یا موا فقت اقرا
ن و ا خوا ن قطع نظر از حصو ل
منفعت و لحو ق مضر ت جا ری شدہ
باشد پس ہمیں امر را رسم میگو ئیم
پس باید دا نست کہ ہمه
رسو م شادی و ما تم و ولادت و ختنه
و رسو ے کہ از عنوا نات شرا فت در
عوا م الناس شمردہ میشود مثل مغا
لات در با ب مہر یعنی کثرت مقدار و
مثل اجتنا ب از حر ف و صنا ئع در
باب مکا سب باو جود ا حتیا ج بسو
ئے آن و مثل احتراز زن بیوہ از نکا ح ثا
نی و مثل استنکا ف از اشتغا ل بحوا ئج
خود از بیع و شراء و بر داشتن اسبا ب
خود بر دوش و ہم چنیں است استنکا
ف پیر زا دہ ہا و مو لوی زادہ ہا از زی
و لباس سپاہیاں از حمل سلا ح و امثا
ل آں ہمه از قبیل بدعا ت حکمیه
است به نسبت اکثر ناس۔

مسئله رابعه:

اتبا ع انبیاء علیهم السلام در ا حکا م
مختصه بنفو س شر یفه ایشا ن یا در
زلا ت صادرہ از مقتضائے بشریت ایشان
یا در ا حکا م مختصه ببعضے از افراد
امتیا ن ایشا ن بنص ایشا ن مثل عد م
انتقاض و ضو بنوم و حلت ما فوق
الا ربع در با ب نکا ح کہ مخصو ص بآ
نجنا ب است و مثل استغفار برائے
مشر ک و نماز برجنازہ منافق کہ
بطریق زلت واقع گر دیدہ و مثل امتناع
از نکا ح ثا نی کہ مختص با زوا ج مطہرا
ت و اجتنا ب از اخذ صد قا ت وا جبه
از زکوۃ و صدقه عید الفطر و نذر و
کفارا ت کہ مختص به بنی ہاشم است
و کفا یت شہا دت شا ہد وا حد
درمقام شہادت شا ہد ین کہ مختص
بذی الشہا دتین است ۔ و حکم قطعی
بدخول جنت کہ مختص ببعضے
صحابه و اہل بیت است و امثا ل این
امور از اقبح بدعا ت حقیقیه است
اگر اعتقا د بعمو م ا حکا م مذ کور
داشته با شد و اتباع ز لا ت باعث
حصو ل ثوا ب دا نسته با شد و از
بدعات حکمیه است اگر فقط عمل
بآن کردہ با شد بشر طیکه آ ن عمل از
ممنوعات شر عیه نبا شد مثل نکا ح ما
فو ق ا لار بعه و مثل جمیع زلا ت

مسئله خامسه:

اقتدائے صحا به و تا بعین و تبع تا بعین
رضوا ن اللہ علیهم اجمعین در امور
یکه از بعضے ایشا ن بطر یق ندرۃ صادر
شدہ و بحد روا ج و تعا مل بلا نکیر
نرسیدہ و دلیل از کتا ب و سنت و
قیاس صحیح منقو ل از مجتهد ین بر
آ ن قائم نگر دیدہ مثل استمداد از اہل
قبور کہ از اعرا بی در زما ن امیر المو
منین حضرت عمر منقول است و مثل
زیارت قبور در حق نساء منقو ل از
حضرت عا ئشه و حکم حلت متعه و
جواز مسح رجلین در و ضو منقو ل از
ابن عباس و نوا ختن عود از عبد اللہ
بن جعفر و حکم بحلت مطلقه ثلا ثه
بمجر د نکا ح ثا نی خا لی از و طی
منقول از سعید بن المسیب و ہم
چنیں در امور یکه ہر چند در آں از منه
ظاہر شد لیکن انکار اہل حق در ہماں
ازمنه بران متو جه گر دیدہ مثل
جلوس امراء بر تخت حکو مت و قیام
ملازما ن رو برو ئے آن منقو ل از
معاویه بن ابی سفیا ن و جلو س بر منبر
در خطبه منقو ل از ایشا ن و سا ئر بنی
امیه و بر داشتن دست برا ئے دعا در
خطبه منقو ل از بعضے رؤسا ئے بنی
امیه و بنائے منبر در عید گاہ و تقدیم
خطبه بر صلوۃ منقو ل از ایشا ن و
امثال آن از امو رے کہ در آن وقت
ظاہر شدہ اما انکار اہل حق بر آ ن
متوجه گر دیدہ ہمه از قبیل بدعا ت
حقیقیه است اگر فا علش آ نرا از قبیل
ملحق با لسنه شمر دہ اقتداء ایشان
مینما ید و الا از قبیل بدعا ت حکمیه
است اگر از ممنو عا ت شر عیه نبا
شد۔

مسئله سادسه:

با ید دا نست کہ ہر چند در شر ع شر
یف بسیارے را از افعا ل و اقوا ل و
اخلاق از شعب کفر و نفاق شمر د ہ
اند اما از اطلاق لفظ کا فر و منا فق بر
شخصے خا ص ہمیں متبادر میشود
کہ عقیدہ کفر و نفاق میدارد ہم چنیں
باید فہمید کہ ہر چند ہزارا ن ہزار
امور از قسم بدعت ست کہ پارہ ازاں
بطر یق نمو نه دریں مقا م ذکر کر دہ
شد اما از اطلاق لفظ مبتد ع یا صا
حب بدعت بر شخصے خا ص ہمیں
معنی فہمید ہ میشو د کہ شخص مذ
کور عقیدہ بدعت میدارد ۔پس بنا بر
ارتکا ب اقسا م با قیه از بدعت حقیقیه
و جمع اقسا م بدعت حکمیه مر تکب
آ نرا مبتد ع و صاحب بدعت نتوان
گفت ۔پس چنا نکه از معدود کر دن
بعضے افعال و اقوال و ا خلاق از شعب
کفر و نفاق مقصود ہمیں ست کہ
سامعین از آن اجتنا ب نما یند نه آنکه
آنچه در قر آ ن مجید از ا حکا م کفار
ومنا فقین از قسم قتل و نہب سبیؔ و
ترقیق و وضع جز یه کہ در حق کفار
وارد شدہ و حر مت صلوۃ جنازہ و
ممنو عیت زیارت قبور ایشا ن و نہی از
استغفار برا ئے اموا ت ایشا ن کہ در
حق منافقین وارد شدہ بر صاحب
افعال واقوال و ا خلاق مذ کورہ مطلقاً
اجراء با ید کر د ہم چنیں از تعداد
اقسام بدعت دریں مقام مقصود
ہمیں است کہ سا معین از جمیع

اقسام مذ کورہ اجتنا ب نما یند و راہ سنت خالصه اختیار کنند نه آ نکه آنچه در حد یث شر یف از ا حکام مبتد عین و اہل بدعت از قسم حبط اعمال ایشا ن و حر مت تو قیر ایشان و اجتناب از عیا دت ایشا ن و احتراز از مجا لست و مخا لطت ایشا ن و ممنو عیت ابتداء و مفاتحه در کلام و سلام بایشان بر مرتکب قسمے از اقسام مذکورہ مطلقاً اجراء نما یند حا شا که کسے از منصفان حق طلب ایں راہ افراط و غلو پیما ید۔ نعوذ با لله من ذلک

فا ئدہ ثا لثه:

در بیا ن آنچه در بادی نظر مشتبه ببدعت میشود و فی الحقیقت در آ ن دا خل نیست و آن مشتمل است بر چند مسا ئل :

مسئله اولی:

جمع قر آ ن و تر تیب سور و نماز تروایح بر ہیئت مخصو صه و اذان اول برا ئے نماز جمعه و اعرا ب قر آن مجید و منا ظرہ اہل بدعت بد لا ئل نقلیه و تصنیف کتب حد یث وہم چنیں تعیین قوا عد نحو و تنقید رواۃ حدیث و اشتغال باستنباط احکام فقہیه بقدر حاجت ہمه از قبیل ملحق بالسنت است که در قرون مشہود لہا با لخیر مروج گر دیدہ و بآں تعا مل بلا نکیر درآن قرون جا ری شدہ ۔چنا نچه بر مہرہ فن تا ریخ پو شیدہ نیست آ رے ہر شيء را از اشیاء ممدو حه و شر عیه مر تبه است از مراتب مہمیت و اہمیت و شرا فت و اشرفیت و حسن و احسنیت که از تغیر آن مر تبه بدعت لازم می آ ید قد جعل الله لکلّ شيء قدراً ۔ مثلاً تر تیبے که در آیات قرآن فیما بینہا و در تعوذ و بسمله و سورۃ فاتحه و سائر سور قرآنی در نماز واقع است بمرا تب اہم است از ترتیب اسورہ فیما بینہا که اول از قسم سنت حقیقیه است و ثانی از قسم ملحق با لسنه مثلاً ہر کسے که در قر أۃ صلوۃ تقدیے سورۃ بر فاتحه یا درمطلق قرأۃ تقدیم سورۃ بر بسمله یا تقدیم بسمله بر تعوذ یا قرأۃ سورہ وا حد ہ بتقد یم و تاخیر آ یا ت بعمل آرد زجرے شر عی بحدے باو متو جه خوا ہد گر دید یا حر ما ن از ادرا ک فضیلت قر أۃ قر آن بوجہی لا حق حال او خواہد شد که بعد م رعا یت تر تیب سور در قر أت قر آ ن عشر عشیر آن نخوا ہد شد پس کسے که ترتیب سور را مثل تر تیب اول دا نسته سعی بلیغ در رعا یت آن یا انکار شد ید بر عدم رعا یت آں نما ید البته تر تیب مذکور به نسبت او از قبیل بدعت خوا ہد گر دید و اگر در زما نے از از منه رعایت تر تیب سور بر و جه مذ کور مروج گردد البته انکار کر دن بر ایشان در ان با ب از جمله ا حیاء سنت و اخما ل بدعت شمردہ خوا ہد شد و بذ مه اہل حق لاز م خوا ہد گردید که در مجا مع عا مه رعا یت تر تیب مذکو ر را فر و گذا رند تا افرا ط اہل زما ن فرو نشیند ہم چنیں نماز ترا و یح را بہیئت مخصوصه مساوی به تہجد نبا ید شمر د چنا نچه قول با نی ترا ویح یعنی امیر المؤمنین فاروق اعظم فالّتی تنامون عنہا افضل من الّتی تقومو ن بہا بر آں دلا لت صریح میدارد ۔

مسئله ثا نیه:

احکام مستنبطه مجتہد ین سا بقین خوا ہ با یں و جه باشد که فلاں امر وا جب ست یامندو ب یا مبا ح یا مکروہ یا حرا م یا با یں و جه با شد که فلاں امر ر کن فلا ن امر ست ،یا شر ط او یا بہیئت مکمله او یا سبب او، یا لازم او، یا اثراو، یا ثمرہ او، یا منا فی او، یا عوض او، و امثا ل آ ن۔ و مراد از امر اعم است ازانکه از جنس عقا ید عقلیه با شد یا امور قلبیه یا افعا ل جوارح از عبادات یا عا دا ت یا از معا ملات ہمه از قبیل سنت حکمیه است ہر گز در قسمے از اقسام بدعت دا خل نیست چه جا ئے که از بدعات باشد ۔اما به سه شرو ط ۔

☆☆☆

رمضان کے بعد؟

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علیٰ رسول اللہ وبعد!

کیا روزے دار رمضان کے بعد بھی اسی حالت پر رہتا ہے جس پر وہ رمضان المبارک میں تھا؟

یا کہ وہ اس عورت کی طرح کرتا ہے جس نے سوت کاتا اور کاتنے کے بعد پھر اسے توڑ ڈالا؟

تو کیا وہ جو رمضان المبارک میں روزہ دار، اور قرآن مجید کا قاری اور تلاوت کرنے والا، اور صدقہ و خیرات کرنے والا، راتوں کو قیام کرنے والا اور دوسری کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا تھا۔

کیا وہ رمضان کے بعد بھی اسی حالت پر رہے گا یا کہ کسی اور راہ یعنی شیطان کے راستے کا راہی بنتا ہوا معاصی و گناہوں کا ارتکاب کرنے لگے گا جو اللہ ورحمن کے غضب کا باعث ہوں؟

بلاشبہ رمضان کے بعد مسلمان کا اعمال صالح کرنے پر صبر کرنا اور اسی حالت پر باقی رہنا اللہ کریم ومنان کے ہاں رمضان المبارک کے روزے قبول ہونے کی علامت ہے۔

اور رمضان المبارک کے بعد اعمال صالحہ ترک کرنا اور شیطان کے راستوں پر چلنا ذلت ورسوائی ہے۔

جیسا کہ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے:

جن کی عزت اللہ کے یہاں ختم ہو جاتی ہے تو وہ اس کی نافرمانی شروع کر دیتے ہیں اور اگر وہ اللہ کے یہاں عزت والے ہوتے تو وہ انہیں نافرمانی سے بچا لیتا اور جب بندہ اللہ تعالی کے ہاں ذلیل ورسوا ہو جاتا ہے تو کوئی بھی اس کی عزت نہیں کرتا۔

☆☆☆

